عجیب

قاضی عبدالغفار

عجیب

قاضی عبدالغفار

آئینۂ ادب۔ چوک مینار انارکلی۔ لاہور

بار سوم
۱۹۵۹ء

تعداد۔ ۱۰۰۰
قیمت:- ۱۲/

اہتمام

خود نوشت

م۔ ع۔ سلام آئینہ ادب۔
چوک مینار - انارکلی - لاہور

(استقلال پریس لاہور طبع ہوا)

عجیب کلب

کسی زمانہ میں ـــــ جب بے فکری کے مشاغل اگر پیدا نہ ہوتے تھے تو ایجاد کئے جاتے تھے ـــــ یاروں نے ایک مخصوص کلب قائم کیا تھا، جو عرصہ تک اہم چند بے فکروں کا مشغلہ رہا۔ اس کلب میں صرف وہ لوگ شریک کئے جاتے تھے جو کم از کم ایک آپ بیتی، عجیب اور سچی واردات بیان کر سکتے۔ قاعدہ یہ تھا کہ کلب کی رکنیت کا امیدوار اس قسم کی ایک داستان لکھ کر اپنی درخواست کے ساتھ پیش کرتا تھا اور اراکین کلب اگر اُس داستان کو پسند کر لیتے تھے تو وہ داستان بطور فیس داخلہ قبول کر لی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں کلب کے دفتر میں ایسے بہت سے عجیب و غریب قصے جمع ہو گئے تھے۔ بعض اُن میں

سے ——— بوسیدہ اور پارینہ ——— کلب
کے پرانے کاغذات میں دستیاب ہو گئے۔ اکثر قدیم
ممبروں کا پتہ نشان بھی اب معلوم نہیں ——— خدا
جانے زندہ ہیں یا مر گئے لیکن بہر حال جن ممبران کی نظر
سے یہ تحریر گذرے اُن سے درخواست کی جاتی ہے کہ اگر
کچھ پرانے کلب والے قصّے بھی اُن کو یاد ہوں تو بخل اور سہل
انگاری نہ کریں اور اُن پُرانے نقوش کو ایک دفعہ پھر اُجال دیں
——— ان حضرات میں سے بہت سے تو غالباً
ایسے ہوں گے جن کی جوانی کی یاد کو آٹھ دس بچوں اور ایک
دو بیوی نے مٹا ڈالا ہو گا۔ کچھ ایسے بھی ہوں گے ———
بدنصیب ——— جن کے "زمانہ جاہلیت" کے
نقوش کو زندگی کے مدّ و جزر نے فنا کر دیا ہو گا ———
مگر کچھ تو ضرور ایسے ہوں گے جو بوڑھے ہو کر بھی ابھی ذرا
ذرا جوان ہوں!! اوپر سے سُرخ اور تازہ سیب کی مانند
کھال خشک ہو کر سکڑ گئی ہو گی لیکن ظاہری رنگ و بُو سے
محروم ہو کر بھی ممکن ہے کہ گُودے کے اندر شاید کچھ رس
باقی رہ گیا ہو!! ——— میری طرح!! ——— ان ہی

جوان بوڑھوں کے دروازوں پر میں دستک دیتا ہوں۔ ہے کوئی "عجیب کلب" کا "عجیب ممبر" جواب بھی اپنی کوئی عجیب داستان یا ستان ہمیں سنادے؟ —— کوئی ایسی پھڑکتی ہوئی داستان جس میں زندگی کی حرارت ہنوز موجود ہو! —— ہے کوئی؟ مرحوم کلب کے دفتر پارینہ سے جو کچھ مل سکا وہ تو اس وقت حاضر ہے۔ اُن پُرانے "عجیبوں" میں سے کسی "عجیب" نے اگر یہ آواز سُن لی تو بہت سی داستانوں کی کڑیاں ملتی چلی جائیں گی۔ بہرحال، فی الحال تو یہ اوراق حاضر ہیں ---

---

بہ یادِ رفتۂ اراکین انجمن عجیب!

کھیما

یہ قصہ جناب "صحرا نورد" نے (اصل نام محفوظ ہے)
اپنی درخواست داخلہ کے ساتھ پیش کیا۔ اراکین
مجلس نے اس کو پسند کیا۔ لہٰذا کلب کی ممبریت
کے لئے بطور فیس داخلہ منظور کیا گیا۔

۱۹۰۸ء میں میری عمر ۲۲ سال کی تھی۔ علی گڈھ کالج میں ایف اے تک تعلیم پائی مگر میرا گھوڑا دو مرتبہ اس "ٹٹی" کو کودنے میں ناکام رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باوا جان نے چھوٹے صاحب، بڑے صاحب ننھے صاحب، کالے صاحب، گورے صاحب، غرضکہ ہر قسم کے صاحب لوگوں سے سعی و سفارش کر کے مجھے ایک سرکاری محکمہ میں نمک خوار سرکار بنا ہی دیا۔ اپنے عہدے کے فرائض کی انجام دہی کے لئے مجھ پر لازم تھا کہ شمالی ہندوستان کے ایک ایسے وحشت ناک صحرائی اور پہاڑی حصے میں گھوڑے کی پیٹھ پر لدا ہوا مارا مارا پھرا کروں جس کا کچھ حال اصل قصہ بیان کرنے سے پہلے سنا دینا چاہیئے تاکہ پڑھنے والے میری داستان کے ماحول سے کسی قدر آشنا ہو جائیں۔

شمالی ہندوستان میں ہمالہ کے سربلند سلسلہ کا دامن سینکڑوں میل پھیلا ہوا ہے سینکڑوں ہزاروں میل لمبے چوڑے جنگل ہیں ——— اس قدر گھنے کہ سورج کی روشنی بمشکل ان

کے اندر پہنچ پاتی ہے ـــــــ اور اس قدر مرطوب کہ گرم موسم کی جلتی ہوئی دوپہر میں آپ یکایک اُس جنگل کے اندر داخل ہوں تو مارے سردی کے کانپنے لگیں۔ خدا کی اس زمین پہ صبح صادق کی ہلکی روشنی اور گلابی جاڑوں کی سردی بارہ مہینے قایم رہتی ہے۔ سرکاری اصطلاح میں دامنِ ہمالہ کے ان جنگلوں کو "ترائی" کہتے ہیں اور واقعی یہ اسم صفت ہے بھی اُس جنگل کی دنیا کا صحیح نام۔

اُس خطے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قدرت نے وہاں اپنی نعمتوں اور لعنتوں کو یکجا کر دیا ہے ـــــــ پہلو بہ پہلو ـــــــ زہر اور شہد! سرسبزی و شادابی، قدرتی مناظر کا حُسن روح پرور، حسین پرندوں کے ساحرانہ نغمے ـــــــ یہ سب ایک طرف، اور دوسری طرف لاکھوں کروڑوں حشرات الارض ـــــــ سانپ، بچھو، شیر، ہاتھی، ریچھ، دلدلیں، بیماریوں کے جراثیم، زہریلے کانٹے اور ہر وہ چیز جو انسان کی جان کی دشمن ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خالق نے اپنی قوّتِ تخلیق کے سارے خزانے خوب ہی دل کھول کر اِن جنگلوں میں لٹائے ہیں۔ خوبی، کمال اور کثرت، تینوں چیزیں موجود ہیں! ہر چیز میں ـــــــ

نعمت ہو یا لعنت ـــــ کثرتِ مقدار و تعداد سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ سبزہ اور قدرتی مناظر، دریا، جھیلیں، حسین اور خوش گلو پرند ـــــ اتنے ہیں کہ شمار سے باہر۔ اسی طرح سانپ اور شیر اور خونخوار جانور ـــــ اتنے ہیں کہ اُن کی تعداد اندازے سے باہر ہے! القصہ لعنتوں اور نعمتوں کے اس ہجوم میں جو انسان اپنی زندگی کے بارہ مہینے گذار دے اور پھر وہ اس داستان کو بیان کرنے کے لئے زندہ بھی رہے وہ انسان یقیناً آپ کے کلب کا ممبر بنائے جانے کا استحقاق رکھتا ہے!

سرکاری پروانہ آیا تو ـــــ مجھے یاد ہے ـــــ ابا جان بہت ہی خوش ہوئے۔ لیکن ہمارا یہ حال تھا کہ اپنی قسمت پر لعنت بھیجتے گھر سے نکلے! کام ہمارا یہ تھا کہ ہم اُن جنگلوں میں بارہ مہینے دورہ کرتے رہیں اور دورے کا حال یہ تھا کہ دو چار ملازم اور ماتحت ہمارے ساتھ اور ہم ـــ ایک خیمہ، دو گھوڑے (جن میں سے ایک کو ایک دفعہ شیر کھا گیا!) ایک رائفل، ایک معمولی بندوق! ـــــ جنگل میں جہاں دس پانچ گز زمین کھلی

ہوئی پائی ڈیرہ لگا دیا ——— خیمے کے چاروں طرف خندق ، خندق میں رات بھر آگ روشن تاکہ خونخوار درندے خیمہ پر حملہ نہ کر سکیں خیمے کے اندر ہم ایک پلنگ پر جس کے چاروں پائے پانی سے بھری ہوئی ناندوں میں رکھے ہوتے تھے تاکہ زہریلے جانور بستر پر نہ آسکیں !! غروبِ آفتاب کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک حال یہ ہوتا تھا کہ ہم پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں فرش پر قدم رکھ نہیں سکتے ، ایک بندوق ہماری گود میں رکھی ہے ، باہر خیمے کے گرد ، شیر دھاڑ رہے ہیں ، سو سو دو دو سو ہاتھیوں کا گلہ چکر لگا رہا ہے ، دو چار ریچھ گھوم رہے ہیں ——— یہ تو باہر کا حال ہے ——— اور اندر ؟ ——— خیمے کے اندر فرش پر سانپ دوڑ رہے ہیں ——— دو ، چار ، چھ ، دس ، ——— ناچ رہے ہیں ! ——— ہماری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ، جسم پر ٹھنڈا پسینہ ہے ، ہاتھ قابو میں نہیں ، پانی کی صراحی پاس رکھی ہے ۔ ہر پانچ منٹ میں حلق کو تر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ! ——— مغرب کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک یہ حال رہتا تھا ! آفتاب کی پہلی شعاع جنگل کی الجھی ہوئی شاخوں میں داخل ہوئی اور رات کا یہ تماشہ ختم ہوا ، جنگل کے تمام خوفناک

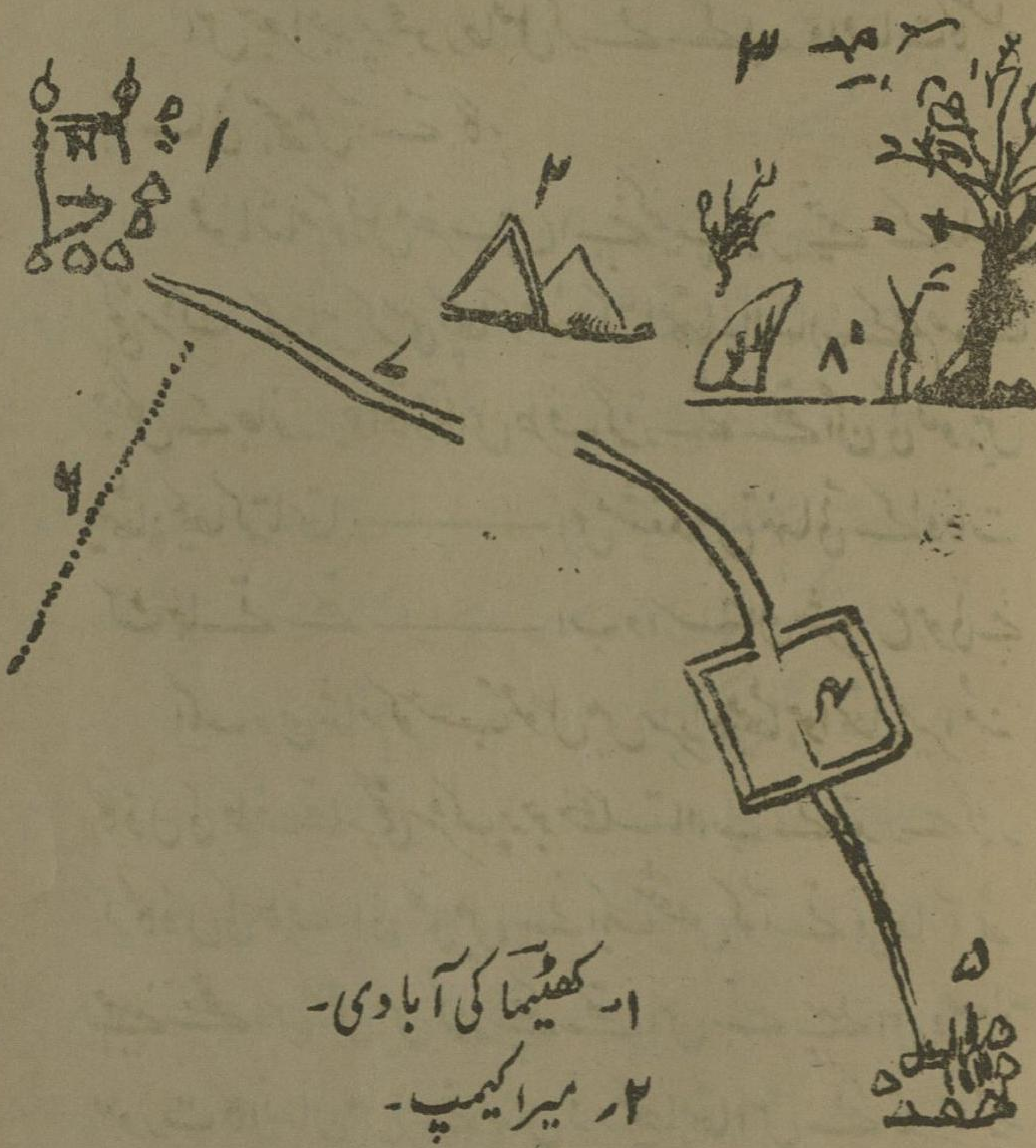
ایکٹرا سٹیج سے رخصت ہو کر اپنے اپنے ٹھکانے لگے اور صبح صادق کی روح پرور فضا میں خوش گلو پرندوں نے اپنے گیت شروع کر دئیے !! ——— بارہ مہینے اللہ کی زمین پر، راقم الحروف کی زندگی اس طرح گزری ——— غور کیجئے !!

قصہ مختصر، یہ جگہ تھی، یہ سماں تھا، یہ ماحول تھا، جہاں ایک عجیب غریب واقعہ مجھ پر گزرا۔

جنگل کی سرحد پر، پیلی بھیت کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کا نام کھیٹما تھا۔ جنگل کے مصائب سے گھبرا کر کبھی کبھی میں اس آبادی کے پاس نکل آتا تھا اور کسی نہ کسی بہانہ سے دو چار دن یہاں گزار کر اپنے فرسودہ اعصاب کو آرام دیتا تھا۔ اس طرف آکر ٹھہرنے اور دم لینے کی ایک اور وجہ بھی تھی، وہ یہ کہ کچھ کھانے کو مل جاتا تھا، انسانوں کی کچھ غذا میسر آجاتی تھی، ورنہ اُن جنگلوں میں تو سوائے سوکھی ہوئی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں اور آلوؤں کے کوئی چیز کسی بھاؤ نصیب نہ ہو سکتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ دودھ کا ایک قطرہ میسر نہ آسکتا تھا۔ حالانکہ اُن جنگلوں کا ہر کاشتکار دو دو سو گائے بھینسیں پالتا

تھا اور اُس کے یہ گلے جنگلوں میں پھرتے رہتے تھے لیکن خدا کی اس انسان صورت جنگلی مخلوق کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ دودھ بھی کوئی پینے کی چیز ہے! "کھٹیما" میں قریب کے اضلاع سے دودھ آتا رہتا تھا اور جب میں وہاں مقیم ہوتا تھا تو خدا کی یہ نعمت مجھے بھی نصیب ہو جاتی تھی! اپنی شیر خواری کے زمانہ میں دودھ کی طرف جو رغبت ہوگی وہی اب جوانی میں مجھے کھٹیما آنے کے لئے بے تاب کیا کرتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا جنّت کی کسی نہر کا بہاؤ آسمان سے زمین کی طرف ہو گیا ہے۔ اور گویا اُس نہر کا خالص دودھ "کھٹیما" میں اللہ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے!

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جب میرا کیمپ "کھٹیما" کی طرف آیا تو معلوم ہوا کہ بستی کے اندر سخت طاعون پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ میرا خیمہ بستی سے کچھ فاصلہ پر باہر لگایا گیا۔ اس موقع کا صحیح اندازہ اس نقشہ سے کر لیجئے :-



۱۔ کھیما کی آبادی۔

۲۔ میرا کیمپ۔

۳۔ جنگل

۴۔ ایک خشک تالاب

۵۔ ایک گاؤں

۶۔ ریلوے لائن

۷۔ کچی سڑک۔

اس جغرافیہ پر عبور حاصل کرنے کے بعد واقعات کا سلسلہ
بہ آسانی سمجھ میں آئے گا۔

عموماً شام کو قبل مغرب میں اپنے کیمپ میں خیمے کے سامنے
کچی سڑک کے پاس کرسی بچھا کر بیٹھا کرتا تھا۔ انسان کے ہم صورت
جنگل کے جانور، جو اکّا دُکّا اس طرف گزرتے تھے اُن کی صورتیں
بیٹھا دیکھا کرتا تھا ——— اس مشغلہ میں تنہائی کے اوقات
کٹ جاتے تھے ——— اب داستان شروع ہوتی ہے۔

ایک دن شام کو حسب معمول میں سرِ راہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرا مُنہ
گاؤں کی طرف تھا۔ کچی سڑک پر جو خشک تالاب کے اندر سے گزر
کر گاؤں کی طرف جاتی تھی میں نے ایک شخص کو آتے دیکھا۔ آٹھ
مہینے مجھے اس جنگل میں گزر چکے تھے، اس سے پہلے اس وضع اور
صورت کا انسان میں نے یہاں نہ دیکھا تھا اس لئے قدرتاً کرید
پیدا ہوئی۔ جب وہ صاحب میرے قریب سے گزرنے لگے
تو بے اختیار میں نے اُن کو مخاطب کر کے کہا۔ "السلام علیکم" وہ
میری آواز سُن کر رُک گئے نہایت شائستہ اور شیریں آواز
میں اُنہوں نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے کہا "تشریف لائیے"
اور وہ بے تکلّف خالی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے

پہلے اس سے کہ داستان کا سلسلہ بڑھاؤں، ذرا اُن کا حُلیہ بھی سُن لیجئے:۔

حُلیہ کے متعلق کیا اس قدر کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ یہ صاحب اتنے حسین اور خوشرو تھے کہ میں نے اپنی عمر میں اُن سے زیادہ حسین آدمی نہیں دیکھا! مردانہ حُسن کا ایک عجیب و غریب نمونہ تھا جو میں نے نہایت میلے اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں دیکھا۔ آج تک وہ تصویر میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے! وضع قطع بھی دیکھ لیجئے:۔ پاؤں میں زردمخمل کی پھٹی ہوئی سلیم شاہی، چوڑی دار پاجامہ ——— میلا اور پھٹا ہوا ——— باریک ململ کا کُرتہ جس پر لکھنؤ کی چکن بنی ہوئی ——— مگر نہایت میلا اور بوسیدہ۔ سر پر دوپلی ٹوپی ——— وہ بھی میلی!! سر پر چھوٹے چھوٹے پٹے، بالوں میں تیل اور مانگ نکلی ہوئی، چہرہ پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں لیکن داڑھی ندارد، مُنہ میں پان، آنکھوں میں سُرمہ کا ہلکا سا خط ——— یہ اُن کی تصویر ہے، میں نقاش یا مصور ہوتا تو رنگ اور مُوقلم سے کاغذ پر کھینچ دیتا ——— ان کا بال بال میری نظر میں محفوظ ہے ———

میں نے کہا حضرت! آپ جیسا آدمی یہاں کہاں؟ کہنے لگے "کیوں؟ مجھ میں آپ نے کیا خاص بات پائی؟" میں نے کہا حسن اور شائستگی، جو اس ویرانہ میں عنقا ہے! مسکرائے! کہنے لگے "کیسی غلط بات آپ فرما رہے ہیں، حسن کی موجودگی سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ اسی طرح جس طرح خدا ہر جگہ موجود ہے! آپ نے ترائی کے بھینسوں، ببچھول، ہاتھیوں اور سانپوں میں حسن کو نہیں دیکھا؟" میں نے کہا "یہ سب صحیح، مگر اس اُجاڑ میں آج پہلی ہی دفعہ تصوّف کے یہ موتی بکھرتے ہوئے دیکھے ہیں"۔ مسکرا کر کہنے لگے "اگر کان نہ سنیں اور آنکھیں نہ دیکھیں تو کیا اس دلیل پر ہم موتی کے وجود سے انکار کر سکیں گے! ——— بھائی صاحب"! میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے ——— بدصورت سے بد صورت مرد اور بدصورت سے بدصورت عورت میں حسن ازل موجود ہے ——— ہم آپ دیکھتے نہیں!" ———

غرض کہ اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ یہ حضرت کوئی غیر معمولی انسان ہیں ——— یہ وضع قطع اور حسنِ ازل پر گفتگو! بہت سی معمولی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر وقت کم تھا ——— اُنہوں نے کہا کہ مغرب سے پہلے اُن کی واپسی ضروری ہے اور دوسرے

دن آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے

دوسرے دن وہ کوئی ۱۲ بجے آ گئے میں نے اُن سے دریافت کیا کہ وطن اور مکان کہاں ہے۔ کہنے لگے "سامنے گاؤں میں رہتا ہوں —— کئی سال ہو گئے —— زراعت سے معاش پیدا کرتا ہوں —— فرصت کے اوقات میں جنگل کی سیر کرتا پھرتا ہوں —— "چاہتا تھا کہ پوچھوں کہ آخر اس ویرانہ میں وطن کیوں بنایا —— مگر ابتدائی ملاقات میں کچھ ہمت نہ ہوئی —— وہ ہر روز آنے لگے اور ہر روز ان کے نئے نئے کمالات اور جوہر بھی آشکار ہونے لگے۔ شاعر تھے اور پھر سخن فہم، ہزارہا شعر، اردو، فارسی کے ان کو یاد تھے، ——

کھانا نہایت نفیس پکاتے تھے۔ جیسا اُنہوں نے پکا پکا کر کھلایا آج تک کبھی نصیب نہ ہوا۔ یا تو یہ حال تھا کہ سوکھے آلو اور سوکھی مچھلی پر جسم وجان کے تعلّق کا انحصار تھا۔ یا یہ "عیاشیاں" شروع ہوئیں کہ وہ روز کھانے پکانے کا کچھ نہ کچھ سامان رومال میں باندھ کر لاتے اور بریانی اور کباب اور زردہ

اور قسم قسم کے میٹھے کھانے، بیٹھ کر پکاتے، خود بھی مزے لے لے کر کھاتے اور مجھے بھی اتنا کھلاتے کہ کھاتے کھاتے لیٹ جاتا! ———

شطرنج خوب ——— خوب نہیں بلکہ استادانہ ——— کھیلتے تھے!

علمی حالت بہت بلند تھی، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے، کم از کم مجھے تو زبان کھولنے کا موقع ملتا نہ تھا ———

تین چار ہی دن میں کچھ ایسے بے تکلف ہو گئے کہ "تم" اور "تو" تک نوبت آگئی۔ اور ذرا بے تکلفی بڑھی تو پٹنہ والی زہرہ اور الہ آباد کی چھپن چھری اور کلکتہ کی گوہر کے تذکرے ہونے لگے ——— اس سلسلہ میں پتہ چلا کہ موسیقی سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ گاتے بھی خوب ہیں ———

میں سوچتا تھا کہ خدا کی شان دیکھو، اس ویرانہ میں جہاں انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گئے۔ یہ مافوق الانسان نظر آیا!! ———

ایک دن کہنے لگے: "میاں! جانتے ہو دنیا میں خدا کی دو بہترین نعمتیں کیا ہیں۔؟"

میں نے کہا:۔ "کیا؟" کہنے لگے" ایک نعمت حسین عورت اور ایک نعمت اچھی غذا!"

"مگر" ——— کہنے لگے ——— اس اُلّو کے پٹھے نے ——— جس کا نام انسان ہے، کبھی نہ جانا کہ ان دو نعمتوں سے مستفیض کیونکر ہونا چاہیئے! ——— عورت کو بچے پیدا کرنے کی مشین یا اپنی نفس پرستی کا آلہ بنا لیا اور اچھی غذاؤں کو اس گنوارپن کے ساتھ کھانا شروع کیا کہ بدہضمی ہونے لگی! ——— اب ضعف باہ او ضعف معدہ کے لئے نسخے تلاش کرتا پھرتا ہے!" میں نے کہا:۔ "شاید مرد کی فطرت ہی یہ ہے"، کہنے لگے" کیا بکواس کرتے ہو، فطرت بھی کبھی غلط ہو سکتی ہے ——— فطرت کا نام کیوں لیتے ہو ——— جس کو تم جیسے گدھے فطرت کہتے ہیں وہ درحقیقت تمہارا آوارہ اور بے کار نفس ہے ———" پھر کچھ سوچ کر بولے "تمہیں معلوم ہے، عورت عنقریب اپنا بدلہ تم سب سے لینے والی ہے ——— ایک لطیفہ سناؤں ——— ان جنگلوں میں ایک وحشی قوم آباد ہے ——— تعداد تو زیادہ نہیں، یہی کوئی دس بارہ ہزار نفوس ہیں۔ مگر ان کے

تمدن میں مرد اور عورت کی حیثیت بالکل منقلب ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کی قوم میں ہر عورت برہمن ہے اور ہر مرد چمار! یعنی میاں بیوی اور باپ بیٹی ایک دوسرے کے قریب نہیں آ سکتے ایک دوسرے کے ساتھ کھا نہیں سکتے، ایک دوسرے کا برتن استعمال نہیں کر سکتے! عورت کی نظر میں مرد نجس لعین ہے! ——— یہ اس بغاوت کی بدترین صورت پیدا ہو گی"———

اُن کی گفتگو کا یہ ایک نمونہ میں نے پیش کیا۔ اُن کی وجہ سے کئی ہفتہ میں "کھیٹما" میں ٹھہرا رہا۔ بہت چاہا کہ وہ دَورہ میں میرے ساتھ چلیں، یا کسی رات کو میرے خیمہ میں قیام کریں۔ لیکن اس پر وہ کبھی آمادہ نہ ہوئے ———

چند روز کے لئے میں جنگلوں میں چلا گیا۔ پھر ان کی یاد کا ستایا ہوا "کھیٹما" آیا۔ جس دن میں آیا اس کے دوسرے دن صبح کو وہ آئے۔ کوئی ۱۱ بجے کا وقت تھا۔ میں خلافِ معمول خیمہ کے فرش پر بیٹھا ہوا کچھ دفتر کے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ میرا پیشکار سامنے بیٹھا تھا۔ میں عموماً مانیوں کے ڈر سے بہت

کم فرش کی نشست پسند کرتا تھا۔ لیکن اُس دن حساب کتاب کے بہت بڑے بڑے رجسٹر دیکھنے تھے اس لئے ان کو پھیلا کر سامنے رکھنے کے لئے فرش پر بیٹھنا پڑا تھا۔ وہ آئے اور وہیں فرش پر میرے پاس بیٹھ گئے۔

یکایک میرا پیشکار اُٹھ کر بھاگا:۔ سرکار! سانپ، سانپ!

"ارے کہاں؟ کدھر؟" میں نے کہا۔

"کتاب کے نیچے، کتاب کے نیچے، اس کو نہ چھوئیے"

پیشکار بالکل بدحواس ہو رہا تھا۔ میں بھی اُٹھ کر بھاگا اور بھاگ کے خیمہ کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

یہ حضرت اس تمام شور و شر میں بدستور بیٹھے رہے۔ چہرہ پر وہی مسکراہٹ قائم تھی جو ہمیشہ اُن کے چہرے پر کھیلتی رہا کرتی تھی۔ میں نے کہا:۔ خدا کے لئے بھاگو، بیٹھے کیا دیکھ رہے ہو؟ مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑی کتاب کو اٹھایا —— بھورے رنگ کا ایک پتلا، ڈیڑھ ہاتھ لمبا سانپ، پھنکار مار کر اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں مبہوت اس منظر کو دیکھ رہا تھا، انہوں نے بے تکلف ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ لی۔ سانپ نے پلٹ کر اُن کے ہاتھ کی پشت پر پے در پے تین جگہ کاٹا ——

تینوں جگہ خون نکلنے لگا ——— دوسرے ہاتھ سے انہوں نے اُس کا سر توڑ کر جسم سے علیحدہ کر لیا، اور اس کو خیمہ کے باہر پھینک کر اپنے کُرتہ کے دامن سے اپنے ہاتھ کا خون صاف کرنے لگے :-

"بہت زہریلی قسم کا تھا، یہ سانپ، ہم لوگ اس کو سینٹک کہتے ہیں ——— دیکھنا ذرا کسی ملازم سے کہو کہ اس کے سر کو کچل کر کہیں دور پھینک دے" ———

وہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے یہ ہدایات جاری فرمارہے تھے اور میں اُن کی صورت دیکھ رہا تھا!

"جاؤ، جاؤ، بہت جلدی ڈاکٹر صاحب کو لاؤ" میں نے پیشکار سے کہا۔

"جی نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ خون نکل گیا، زہر بھی نکل گیا" انہوں نے اس قدر اطمینان کے ساتھ فرمایا کہ مجھے غصّہ آگیا۔

"عجب اُلّو ہو تم! سانپ کا زہر بھی ایسی چیز ہے جسے تم ہضم کر جاؤ، انسان ہو یا کوئی دیو یا بھوت" میں نے جل کر کہا۔

"خیر، جانے دو، ہوش میں آؤ، یہاں آکر بیٹھو، آؤ اپنے

پوچھو، انسان ہو! کہہ تو دیا تم سے کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر ہی نہیں ہوا کرتا۔"

"دس منٹ میں تم لمبے لمبے لیٹ جاؤ گے

شاید اپنی جوانی پر اکڑ رہے ہو!"

وہ مسکرا رہے تھے!!

"بات اصل یہ ہے کہ میں عادی ہو گیا ہوں۔ ہزاروں دفعہ سانپوں نے کاٹا ہے، اب کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔"

"سانپ کاٹے اور اثر نہ ہو! یا تم باؤلے ہو یا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"پاگل، نہ تم ہو نہ میں ہوں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ دیکھو، خود تم کو معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا——

اچھا اب ذرا باورچی کو بلاؤ تو میں بریانی پکانے کا انتظام کروں"

آج تک میں حیران ہوں کہ وہ قصہ کیا تھا۔ ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے اُن کو کوئی دوا ایسی معلوم ہو، یا کوئی عمل یا تعویذ ایسا ہو جو اُن کو سانپ کے زہر سے محفوظ رکھتا ہو، بہت پوچھا بہت اصرار کیا۔ لڑا، جھگڑا، خوشامد کی، مگر اس اللہ کے بندے

نے کچھ بھی نہ بتایا کہ یہ بھید کیا ہے۔

ایک دن میں اور وہ بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے، باتوں باتوں میں ان جنگلوں کے زہریلے جانوروں کا ذکر آ گیا، کہنے لگے: "تم نے کبھی یہاں کے بچھو بھی دیکھے ہیں؟"
میں نے کہا دیکھے تو نہیں مگر سنا ہے کہ ظالم ایک ایک بالشت لمبے ہوتے ہیں اور بے حد زہریلے!" کہنے لگے: "میں تمہیں دکھاتا ہوں" ——
یہ کہہ کر انہوں نے سر سے ٹوپی اتاری اور اس کو سامنے فرش پر لوٹ دیا۔ میں کیا بتاؤں میرا کیا حال ہوا۔ میں سانپ سے زیادہ بچھو سے ڈرتا ہوں اور وہ بچھو جو ان کی ٹوپی میں سے نکلا! —— اللہ محفوظ رکھے ——
دس انچ سے تو کم نہ ہوگا! میں اٹھ کر بھاگا۔ میں نے کہا خدا کے لئے اٹھاؤ اس کو، میرا تو دم فنا ہو رہا ہے! مسکراتے ہوئے انہوں نے اس کا ڈنک پکڑ کر اٹھا لیا اور پھر اپنی ٹوپی میں رکھ کر ٹوپی سر پر رکھ لی! ——
"ہو نہ ہو، کوئی عمل یا تعویذ ہے" میں نے کہا "کچھ بھی ہو

تمہیں بتانا ہوگا ـــــــــ اپنی تمہاری جان ایک کر دوں گا
آج تم نہیں یا میں نہیں ـــــــــ بتاؤ!"

میں اُن کے سر ہوگیا۔ کہنے لگے "بیٹھو، ذرا دم لو، بات سُنو، اس کو ـــــــــ میرے سر ہونے سے کیا فائدہ ـــ کچھ ہو تو بتاؤں، کیسا عمل اور کیسا تعویذ، میں نماز تک تو پڑھتا نہیں ـــــــــ اللہ کا نام لینا ہی دشوار ہے، بھلا عمل اور تعویذ کا کیا ذکر ہے، میں بے چارہ ساری عمر کا رِند اور خراباتی، میں کیا جانوں پیروں کی کرامات"۔

میں نے کہا۔ "میں تو نہ مانوں گا، کچھ تو ضرور ہے سانپ کا زہر تم پر اثر نہیں کرتا، ایسے خوفناک بچھو کو تم سر پر رکھے پھرتے ہو ـــــــــ"

قطع کلام کر کے کہنے لگے: "سُنو، سُنو، تم نے کبھی خوف کے فلسفہ پر غور نہیں کیا، انسان کے تمام محسوسات میں خوف سب سے قوی ہے۔ مذہب والوں نے بھی اُس کی قوّت سے بہت کام لیا ہے پیر، فقیر اور حاکم سب اس سے کام لیتے ہیں۔ خوف نہ ہو تو دُنیا میں کوئی کسی کا محکوم نہ رہے۔ ـــــــــ یہ جو سب لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے اپنے ہاتھوں پر

پر بیعت کراتے ہیں، لوگوں سے چُمواتے ہیں، گلے میں ہار ڈلواتے ہیں یہ سب اسی جنس کے سوداگر ہیں۔ دلوں میں خوف پیدا کر کے اپنا کاروبار چلاتے ہیں!! اپنی زندگی کی ترکیب سے خوف کے عنصر کو نکال دو، پھر دیکھو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مرعوب نہ کر سکے گی سانپ کے زہر میں ہلاکت کے جن اجزا کو شامل سمجھتے ہو وہ درحقیقت زہر کے اندر موجود ہی نہیں، وہ خود تمہارے اندر ہیں۔ اپنے اندرون کو اُن اجزا سے پاک کر لو، پھر سانپ کے مُنہ میں انگلی ڈال دو، ویسے ہی محفوظ رہو گے جیسا میں ہوں! سمجھے؟"

"خاک بھی نہ سمجھا" میں نے کہا "سمجھوں تو جب، جب تم سمجھنے کی کوئی بات کہو" ———— خوف کا ایک عجیب فلسفہ نکال کر لائے ہو، خوف تو فطرتِ انسانی کا ایک جزو ہے ——"

"نہیں، غلط! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ خوف فطرتِ انسانی کا ایک جزو ہے ———— شیر خوار بچہ بالکل بیخوف ہوتا ہے، سانپ کا مُنہ اُس کے مُنہ پر رکھ دو، آگ کی طرف اُس کا ہاتھ لے جاؤ، کبھی خوف زدہ نہ ہوگا۔ مگر جب شعور آئے گا تو وہ دیکھے گا کہ آگ سے سب ڈرتے ہیں، سانپ سے سب خوفزدہ

ہیں، خوف کے جراثیم اُس کے دماغ میں جگہ پائینگے۔ اور اُس کی فطرت مسخ ہوکر رہ جائے گی! ——————

"عجیب مسخرے ہو" میں نے کہا "ساری دنیا کے علوم سے اور انسان کی صدیوں کی تحقیقات سے انکار کر کے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو
میں اصل حقیقت معلوم کر کے رہوں گا، آج نہ سہی کل سہی۔"

غرضکہ ہر روز ان سے اسی طرح تُو تُو مَیں مَیں ہوتی تھی، مگر اللہ کا بندہ کبھی نہ کھُلا کبھی اُس نے ایک حرف ایسا نہ کہا جس سے پتہ چلتا کہ یہ راز کیا ہے۔ وہ جس قدر ٹالتا میری کرُید بڑھتی۔ آخر ایک دن میں نے جھلّا کر کہا:۔

"آج کے دن سے تم میرے قیدی ہو، اب تم کو میرے ہی پاس رہنا ہے، لعنت بھیجو کھیتی اور کاشتکاری پر، میں جہاں جاؤں میرے ساتھ رہو، ابھی دو چپراسی بھیج کر تمہارا سب سامان منگوائے لیتا ہوں۔" ——————

یکایک اس کا مسکراتا ہوا چہرہ نہایت سنجیدہ ہو گیا۔ پیشانی پُر شکن، آنکھوں میں ایک قسم کی چمک، آواز میں لچک کی بجائے کرختگی —————— یہ رنگ میں نے اب تک دیکھا ہی

نہ تھا ــــــ کہنے لگے :۔

"مذاق اور دل لگی سے قطع نظر، ایک بات میری سُن رکھو، وہ یہ ہے کہ میری تمہاری دوستی کی پہلی اور محکم شرط یہ ہے کہ کبھی مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں تمہارے پاس رہوں گا ــــــ یا کبھی ایک شب بھی تمہارے پاس گزاروں گا

میری تمہاری دوستی دن بھر کی ہے، وہ بھی جب تم کھٹیما" آؤ۔ میں کون ہوں، میں کہاں رہتا ہوں، میں کیا کرتا ہوں ــــــ اس سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں۔ جس دن تم نے ان باتوں کی تلاش شروع کی، ہمارا تمہارا یارانہ ختم! اُسی دن ہم تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت! یہ خوب سمجھ لو! ــــــ اب چھوڑو ان فضول باتوں کو، کچھ اور مزے مزے کی باتیں کرو ــــــ آؤ شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔"

میں نے کبھی پہلے ان کی یہ حالت نہ دیکھی تھی، کچھ مرعوب سا ہو کر حیران رہ گیا۔

ایک دن کہنے لگے: "تمہیں مچھلی کے شکار کا بھی کچھ شوق ہے؟" میں نے کہا: "شوق تو ہے مگر میرے پاس سامان نہیں"۔

کہنے لگے "سامان سب میں لیتا آؤں گا۔ یہاں ایک پہاڑی چشمہ میں آج کل مچھلیاں بہت ہیں، کل تمہیں فرصت ہو تو چلیں" —

چنانچہ دوسرے دن وہ آئے۔ مچھلی پکڑنے کی ڈگنیں اور کانٹے اور چارہ سب لے کر آئے۔ میرے کیمپ سے دو میل کے فاصلہ پر جنگل کے اندر وہ ندی تھی۔ ہم دونوں کنارے پر جا بیٹھے۔ کانٹے پانی میں ڈال دیئے مچھلیاں تو بہت تھیں مگر کانٹے کو نہ لگتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ انتظار کر کے میں اکتا گیا۔

کہنے لگے: "کبھی تم نے ہاتھ سے بھی مچھلیاں پکڑی ہیں — آؤ میرے ساتھ" یہ کہہ کر وہ کمر کمر پانی میں گھس گئے میں کیا بتاؤں میں نے کیا دیکھا، ایک لمحہ کے اندر سینکڑوں مچھلیاں — بڑی اور چھوٹی — اُن کے چاروں طرف کودنے لگیں اور اور وہ ان کو ہاتھ سے پکڑ پکڑ کر کنارے پر پھینکنے لگے — مچھلیاں اس طرح اُن کی طرف آتی تھیں جس طرح مقناطیس لوہے کے ٹکڑے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور میں حیران و ششدر یہ تماشہ دیکھ رہا تھا —

آخر وہ دریا سے باہر آئے! میں نے کہا: "قسم ہے تمہیں اپنے خالق کی! یہ کیا جادو کیا تم نے؟ اصل حال بتاؤ مجھے!" ہنسنے لگے

چھوٹی چھوٹی خفیف باتیں بھی جن کو انسان نہ سمجھے کس قدر بڑی اور اہم بن جاتی ہیں —— تم جب اِس فن سے واقف ہی نہیں تو سمجھو کیا خاک ——"

میں نے کہا:۔ مردِ خدا! پانی کو بجا کر مچھلیاں پکڑتے میں نے لوگوں کو دیکھا ہے، اور بھی بہت سی ترکیبیں معلوم ہیں مگر اس طرح مچھلیوں کو آدمی کے جسم سے لپٹتے ہوئے تو میں نے نہ سُنا نہ دیکھا" کہنے لگے:۔ "ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے اور سُنا ہی کیا ہے —— بچہ ہو —— لو چلو اب مچھلیوں کو چل کر پکائیں"

ایک دفعہ شیروں اور اسی قسم کے خونخوار جانوروں کا ذکر ہو رہا تھا کہنے لگے کہ اگر تم شیر سے خوف نہ کرو تو وہ تم سے خوفزدہ ہو سکتا ہے —— خوف کے فلسفہ کو سمجھ لو، پھر تم میری حرکتوں پر ذرا بھی متعجب نہ ہو گے —— تم نے سُنا ہو گا لوگ شیر کی گردن پر سوار ہو جاتے ہیں اور ایسی تصویریں تو بہت دیکھی ہوں گی۔ پھر کیا یہ لوگ جو ایسا کر سکتے ہیں جادوگر ہوتے ہیں؟ —— بات صرف اتنی ہے کہ وہ شیر کے دل میں خوف

پیدا کر دیتے ہیں اور اپنے دل سے نکال دیتے ہیں!"

میں نے کہا:- "خدا کے لئے! کیوں مجھ سے مذاق کرتے ہو کل کو کہنے لگو گے کہ میں خود شیر بن سکتا ہوں، ہاتھی کی صورت اختیار کر سکتا ہوں ——— یہ طلسم ہوشربا کی داستانیں!! جو کچھ تمہیں آتا ہے وہی مجھے بتا دو ———

ایک دن وہ میرے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے میرا اہلکار روتا ہوا آیا اس نے کہا کہ اس کی اکلوتی لڑکی کو طاعون ہو گیا اور وہ بستی میں پڑی ہے شطرنج چھوڑ کر یہ حضرت اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے چلو میں دیکھوں۔ مجھ سے کہا تم بھی چلو میں نے عذر کیا ہنسنے لگے ——— "پھر وہی خوف! جب تک خوف تمہارے دل میں جگہ نہ پائے گا، طاعون کبھی غالب نہیں آسکتا! لوگ طاعون میں مبتلا ہو کر صرف اس لئے مرتے ہیں کہ طاعون کے نام سے ڈرتے ہیں، خوف ان کی جان لیتا ہے نہ کہ طاعون!"

——— میں ان کا منہ دیکھتا رہ گیا وہ یہ کہہ کر بستی کی طرف چل دیئے ——— تھوڑی دیر بعد واپس آئے میں نے کہا "کیا کیا تم نے؟ کیا حال ہے مریضہ کا؟"

کہنے لگے :- "بُرا حال ہے، میں کرتا ہی کیا، نہ طبیب نہ ڈاکٹر ——— خدا کرے بے چاری تندرست ہو جائے

اکلوتی اولاد ہے ———"

دوسرے دن صبح کو میں نے اپنے پیشکار سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ رات بھر میں لڑکی کا بخار بھی اُتر گیا اور گلٹیاں بھی غائب ہو گئیں۔ میں نے دریافت کیا کہ دوا بھی کچھ دی تھی یا نہیں تو وہ کہنے لگا کہ دوا تو کچھ بھی نہیں دی۔ البتہ تھوڑا سا گڑ پانی میں گھول کر پلایا تھا اور یہ حکم دے آئے تھے کہ تھوڑا تھوڑا گڑ کھاتی رہے!

تھوڑی دیر بعد یہ حضرت جو آئے تو میں نے کہا:- "کیوں جی، یہ کیا شعبدہ دکھایا تم نے؟ گڑ کھلا کے طاعون کا علاج! کہنے لگے "یوں بھی ہوتا ہے علاج! ——— آج میں شطرنج کا ایک نیا نقشہ سوچ کر آیا ہوں، لاؤ تو ذرا بساط ———"

~~~~~~~~~~

اِس شخص نے میرے دماغ میں اتنے اُلجھیڑے ڈال دیئے تھے کہ میری عقل اُن الجھنوں میں الجھ کر رہ گئی تھی، حیران بھی ہوتا تھا چڑتا تھا، غصہ بھی آتا تھا ——— مگر کرتا کیا؟ بحث کروں تو وہ الٹا مجھ ہی کو بے وقوف بنا دیتے تھے ——— "میں روحانیات
~~~~~~~~~~

"کرامات" اور معجزوں کا قائل نہیں "مادّیت" اور دہریت کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ والد کبھی کبھی میری موجودگی میں اپنے ہم عمر دوستوں کو اس قسم کے قصّے سُنایا کرتے تھے تو میں بیٹھا بیٹھا اُن کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنسا کرتا تھا ——— شعبدہ بازوں کے شعبدے بہت سے دیکھے تھے، ہر ایسی "کرامات" کو اُن شعبدوں میں شامل کر کے سمجھ لیا کرتا تھا کہ پیر جی یا شاہ صاحب نے ابّا جان کو خوب احمق بنایا! ——— مگر اس شعبدہ باز نے تو میرے چھکّے چھڑا دیئے، یہ تو آج تک مجھے یقین نہیں ہے کہ اس شخص کی غیر معمولی حرکتیں کوئی رُوحانی اہمیت رکھتی ہیں مگر کچھ ایسا چکمہ اگیا ہوں کہ اس کو جھٹلا بھی نہیں سکتا! ———

ایک دفعہ میں نے ارادہ کر لیا کہ اس شخص کی پوری "تاریخ" معلوم کی جائے اور اُس کے ماضی و حال سے کچھ اس کی کیفیات کا اندازہ کیا جائے ——— ایک دن صبح کو وہ آئے، شام تک میرے پاس رہے، حسبِ معمول مغرب سے پہلے رخصت ہو کر اپنے گاؤں کی طرف چلے ——— میں نے دل میں کہا کہ آج تو ان کا پتہ نشان معلوم ہی کر لینا ہے۔ کہاں جاتے

ہیں، کہاں رہتے ہیں، کرتے کیا ہیں ——— وہ جب سو دو سو قدم آگے بڑھ گئے تو میں نے اپنے سائیس سے کہا کہ گھوڑا لے کر ان کے پیچھے پیچھے آئے اور خود ایک لکڑی ہاتھ میں لے کر ان کے پیچھے چل دیا۔ کھلے ہوئے میدان میں وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ کہیں لوٹ کر دیکھ نہ لیں۔ بہرحال وہ چلتے چلتے خشک تالاب کے پاس پہنچے اور چونکہ وہ کچی سڑک اُس خشک تالاب کے اندر ہو کر گزرتی تھی وہ تالاب کے نشیب میں میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے اپنی رفتار کو ذرا تیز کر دیا ——— لیکن جب میں تالاب کے کنارے پہنچا تو سڑک خالی تھی، اور وہ غائب تھے!! ——— جنگل نہ تھا جس میں وہ اِدھر اُدھر نکل گئے ہوں، پہاڑیاں نہ تھیں، غار نہ تھے، کوئی آبادی نہ تھی جہاں وہ چھُپ رہتے، کھُلا ہوا میدان اور خشک تالاب ——— کھُلی ہوئی کچی سڑک جو میرے خیمہ سے سیدھی گاؤں کی طرف جاتی تھی!!

——— پھر وہ کہاں گئے، کیونکر چھُپ گئے، کس طرح غائب ہو گئے؟ ——— یہ سوالات ہیں جو آج تک تشنۂ جواب ہیں! ———

ان کو تلاش کرنے کے لئے، کیا کچھ میں نے نہیں کیا، کہاں کہاں آدمی نہ دوڑائے! اس گاؤں کا ایک ایک گھر چھان مارا، کھٹیما کے ایک ایک آدمی سے دریافت کر لیا، جنگلوں میں ڈھونڈھ لیا ۔۔۔۔ لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن، آخری دفعہ میں نے اس خشک تالاب کے کنارے اُن کو دیکھا اور پھر کبھی نہ دیکھا! ۔۔۔۔۔

یہ واردات میری زندگی کا ایک عجیب معمّہ ہے۔

ہرجائی

"اڈیٹر صاحب" نے یہ تحریر بطور فیس داخلہ
پیش کی۔ اراکینِ انجمن کی رائے میں قصہ کافی
دلچسپ اور عجیب ہے۔ اس لئے "اڈیٹر صاحب"
کو انجمن کا رکن قرار دیا جاتا ہے۔

مشرب رندانہ، مزاج مخرور، طبیعت آزاد، عقائد لامذہبی کی طرف مائل، اور پیشہ اخبار نویسی۔ جنگ یورپ شروع ہو چکی تھی، میرا اخبار بمبئی سے شائع ہوتا تھا اور اُس زمانہ میں بہت مقبول تھا، حکومت کی ٹیڑھی نظریں مجھ پر پڑ رہی تھیں میں بھی "چھیڑ" سے باز نہ آتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو میدان جنگ کی خبروں پر سُرخیاں ایسی ہی لکھتا تھا جیسے سانپ بچھو کے ڈنک! اتحادیوں کی فتح کو بھی شکست بنا دیتا تھا، اور دشمن کی شکست بھی میرے اخبار کے کالموں میں "شاندار مدافعت" کے نام سے یاد کی جاتی تھی!

—— پھر کیا تعجب ہے کہ حکومت مجھ سے حد درجہ ناخوش تھی

غضب یہ ہوا کہ اُسی زمانہ میں افغانستان کی طرف سے خطرات پیدا ہونے لگے، افغانوں سے میرے تعلقات وسیع تھے، لہٰذا اب تو خفیہ پولیس کی نگرانی مجھ پر اتنی سخت ہو گئی کہ اگر گھر میں بیٹھ کر روٹی بھی کھاتا تھا تو نوالوں کی صحیح تعداد پولیس کے

رجسٹر میں درج ہو جاتی تھی!! ——— یہ اُس زمانہ کا واقعہ ہے۔

میرا معمول یہ تھا کہ ہر شنبہ کی شام کو چند دوستوں کے ساتھ شہر کے باہر ایک لکھ پتی دوست کے باغ کی صحبتِ عیش میں شریک ہوا کرتا تھا، یکشنبہ کا پورا یومِ تعطیل وہیں گذرتا تھا، دوشنبہ کی صبح کو میں شہر واپس آتا تھا۔ یہ باغ ایک نوجوان بوہرے سوداگر کا تھا اور اُس صحبتِ احباب میں میرے ایک خاص ہم نفس کلکتہ کے ایک نوجوان بیرسٹر تھے جو اب ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ ہر ہفتہ کم از کم ۲۴ گھنٹہ اس طرح بسر ہوتے، کہ کچھ موسیقی کا شغل ہے کچھ لطیف اغذیہ ہیں، اگر چاندنی رات ہے تو باغ کے وسط میں مرمریں حوض کا کنارہ ہے، کبھی قوالی ہے، کبھی ناچ اور گانا ہے، ہُو، حق ہے اور اُس کے تمام یا اکثر ملحقات!!

اس طرح شنبہ کی شام کو ایک دفعہ ہم سب وہاں گئے، یکشنبہ کو دن بھر شطرنج اور تاش کا شغل ہوتا رہا، رات کو ایک مشہور مغنیہ نے اُس محفل کو اپنی موجودگی سے نوازا، دو بجے رات تک

گانا ہوتا رہا۔ جوانوں کی محفل میں اگر شام سے صبح تک طبلہ نہ کھڑکے تو پھر وہ محفل ننگِ جوانی ہے!! اگرچہ "بی صاحبہ" تھکی ہوئی تھیں، دو ہی بجے گھر چلی گئیں۔ کچھ دیر تو ہم سب لبِ حوض پڑے ہوئے خود ہی گایا بجایا کئے اُس کے بعد جوانی پر نیند غالب آئی، صبح سب کو شہر واپس جانا تھا، اس لئے اپنے اپنے بستر پر جا پڑے ——

ایک چھوٹا سا پہلو کا کمرہ تھا، جس میں دو بستر لگے ہوئے تھے، ایک پر میں اور ایک پر میرے دوست بیرسٹر صاحب، موسم قدرے گرم تھا اس لئے کمرہ کا دروازہ کھُلا چھوڑ دیا گیا۔ لیمپ کی بتّی نیچی کر کے اُس کو فرش پر رکھ دیا، ہم دونوں سو گئے! ——

صبح کو تین اور چار بجے کے درمیان میری آنکھ دفعتاً کھُلی اور یہ محسوس ہوا کہ گویا کوئی تیسرا شخص کمرہ میں داخل ہوا ہے۔ صبح کاذب کی روشنی کمرے میں لیمپ کی دھیمی روشنی سے مل کر ایک عجب قسم کا غیر قدرتی نور پیدا کر رہی تھی، —— میں نے دیکھا کہ بالکل سفید —— از سر تا پا —— لباس پہنے ہوئے کوئی صاحب کمرہ کے اندر داخل ہو رہے ہیں، وہ آہستہ آہستہ میرے پلنگ کی طرف بڑھتے آتے تھے۔ اُن کا

حلیہ اور اُن کی وضع قطع ذہن نشین کر لیجئے۔

لمبی اور گھنی سفید داڑھی ——— سفید بُراق ———

چہرہ نہایت نورانی ——— سُرخ و سفید ———

چہرہ کا انداز مغلئی ——— سفید لانبا کُرتہ، کمر سے ایک

سفید پٹکا بندھا ہوا ——— سفید شلوار، پاؤں میں

——— مجھے یاد نہیں کہ کس رنگ کا ———

پنجابی جوتا ——— قد میانہ بلکہ میانہ سے بھی کچھ کم ———

—— اس وضع قطع کا انسان ——— بالکل خواجہ

خضر! ——— اور پھر ہمارے گھر میں!! ہمارے

تمام تخیلات سے کس قدر دُور اور بعید تھا! ——— میں

ذرا چونکا اور ایک لمحہ اُن کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتا رہا، پھر ذرا

گھبرایا اور گھبرا کر چلایا ”کون ہے؟ کون ہے؟ اتنے زور سے

میری آواز بلند ہوئی کہ کمرہ گونج گیا اور برابر پلنگ پر نوجوان پیرسٹر

صاحب گھبرا کر اُٹھ بیٹھے ”کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟“ انہوں

نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ ———

اس سوال وجواب میں دو منٹ بمشکل صرف ہوئے ہونگے

لیکن وہ سفید پوش پیر مرد جہاں کھڑے تھے وہیں غائب ہو

گئے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کب گئے، کدھر گئے، کیونکہ گئے۔ بہرحال ایک عکس کی طرح وہ میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں نے جب یہ ماجرا نوجوان بیرسٹر صاحب سے کہا تو وہ جھنجلا گئے۔

"لاحول ولا قوۃ، نیند خراب کر ڈالی، جب ہی تو تم سے کہتا ہوں کہ ذرا کم کھایا کرو، اناڑی کی بندوق کی طرح پیٹ بھر لیتے ہو، بدخوابی ہوتی ہے تو دوسروں کو بھی بے آرام کرتے ہو!"

میں نے جب اصرار کیا کہ میری نظر نے دھوکا نہیں کھایا تو وہ اور بگڑے:۔

"کہیں تمہارے دادا صاحب تو قبر سے اٹھ کر تشریف نہ لائے ہوں! پوتے کے دیدار کے لئے ترس رہے ہوں گے بیچارے! خدا جانے کہاں کہاں ڈھونڈ کر یہاں تک پہنچے ——— جاؤ دیکھو باہر باغ میں نہ ٹہل رہے ہوں!!"

میں نے پھر کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے زانو کا ایک تکیہ نکال کر میرے سر پر مارا۔ "اُلّو!!" اور یہ کہہ کر کروٹ لے لی۔

صبح کو ہم لوگ شہر آگئے، میں دس بجے اپنے دفتر میں آیا۔ یہ وقت میری انتہائی مصروفیت کا وقت ہوتا تھا اس لئے کہ ۱۲ بجے اخبار کی آخری کاپی پریس کو جاتی تھی۔ لہٰذا دفتر کے اہلکاروں کو عام ہدایت تھی کہ کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے، میرے کمرہ میں نہ بھیجا جائے .... ۱۱ بج چکے تھے اور ابھی مجھے ایک ضروری نوٹ لکھنا باقی تھا کہ چپراسی نے اندر آکر اطلاع دی کہ کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے اُس کو جھڑکا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ اس وقت میں کسی سے نہیں مل سکتا؟"۔

چپراسی نے عذر کیا کہ باوجود منع کر دینے کے وہ صاحب ملاقات پر مُصر ہیں۔ بہت ہی جھلا کر میں نے کہا، اچھا بلاؤ۔۔۔ دروازہ کا پردہ اُٹھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہی رات والے "خواجہ خضر" مُسکراتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں! ——————

بہ یک لمحہ میں غرقِ حیرت ہو کر بدحواس ہو گیا، پھر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "آئیے، آئیے، تشریف لائیے" میں نے بہت ہی ذوق وشوق کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔

"معاف کیجئے میں اس وقت حرج کار کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں، صرف یہ بتا دیجئے

کہ مکان پر آپ سے کب اور کس وقت ملاقات ہو سکے گی، تخلیہ میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں" انہوں نے بہت آہستہ آہستہ اور نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ یہ الفاظ ادا کئے۔ مگر میں تو اب اُن سے باتیں کرنے کے لئے بے تاب تھا۔

"نہیں صاحب! مجھے فرصت ہے، تشریف تو رکھئے" میں نے کہا۔ اُنہوں نے فرمایا۔ "جی نہیں، اس وقت تو میں نہ ٹھہروں گا صرف ملاقات کا وقت مقرر کرنے آیا تھا ———"

غرض یہ کہ تقریبًا پانچ منٹ تک میری طرف سے اصرار اور اُن کی طرف سے انکار ہوتا رہا۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ وہ بعد مغرب میرے مکان پر تشریف لائیں ———

اُس دن بعد مغرب میری بے چینی اور بے تابی انتظار ناقابل بیان تھی۔ سات بجے، آٹھ بجے، نو بجے، دس بج گئے، دروازے پر کھٹکا ہوتا تھا تو میں اوپر کی منزل سے سڑک تک دوڑتا ہوا آتا تھا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، شاید ۱۰ دفعہ اسی طرح اوپر کی منزل سے اُترا اور چڑھا!! کبھی اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتا، کبھی کوئی کتاب اٹھاتی، کبھی کمرہ میں ٹہلنے لگتا، آنکھیں دریچہ کے باہر، کان

آواز پر لگے ہوئے ——— رات کے ۱۲ بج گئے مگر وہ نہ آئے! مایوس ہو کر بستر پر لیٹ گیا، پھر بھی نوکروں سے کہہ دیا کہ دروازہ کا خیال رکھیں کوئی آواز دے تو فوراً کھول دیں! ———

ساری رات گزر گئی، وہ نہ آئے، صبح کو میں دفتر میں گیا، یہ امید تھی کہ شاید دفتر میں پھر تشریف لائیں۔ دن بھر انتظار کے پیچ و تاب میں دل لگا کر کام بھی نہ کر سکا ——— لیکن وہ نہ آئے! ———

پھر شام کو گھر پر انتظار رہا، ایک دوست کے یہاں جا کر کھانا کھانے کا وعدہ کر چکا تھا، مگر معذرت کہلا بھیجی، دو چار بےفکرے ہی ہی ہا ہا کرنے کے لئے آئے، اُن کو ٹال دیا لیکن وہ حضرت پھر بھی نہ آئے! ———

دو تین چار، اسی طرح دس پندرہ دن گذر گئے پیشہ کے کاموں اور یاروں کی صحبت میں بڑے میاں کا تصوّر دھندلا ہو چلا ——— دس پانچ دن میں بالکل ہی بھول جاتا اگر ایک عجیب تر واقعہ پیش نہ آجاتا جس نے اس معمّہ کو اور بھی زیادہ اُلجھا دیا ———

دس پندرہ دن بعد، ایک روز شام کو میں اپنے دو ہم پیشہ دوستوں سے ملنے گیا۔ ایک اُن میں سے مبئی کے بہت مشہور اور مقدس "حضرت مولانا" اور "پیر و مرشد" تھے، اور دوسرے ایک جدید قسم کے اڈیٹر۔ میں جب ان "حضرت مولانا" کے مکان پر پہنچا تو وہ دوسرے دوست بھی وہاں موجود تھے —— اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، ہوتے ہوتے کچھ روحانیات کا تذکرہ چھڑ گیا، باتوں باتوں میں مجھے وہ باغ والا واقعہ یاد آ گیا میں نے کہا "آپ دونوں صاحبوں کو ایک عجیب واقعہ سُناتا ہوں، ایک عجیب واردات ہے مگر مجھ پر ہنسیئے گا نہیں، واقعہ بالکل سچّا ہے، دماغ میرا بالکل صحیح ہے —— " اس تمہید کے ساتھ میں نے وہ واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ جب میں نے صبح کے قریب پیر مرد کا کمرہ میں آنا بیان کیا تو اڈیٹر صاحب نے قطع کلام کر کے مجھ سے سوال کیا:۔

"یہ بتائیے، کس دن اور کس وقت، ٹھیک بتائیے"

میں نے ان کو دن اور وقت بتایا اور پھر اپنا قصہ شروع کیا، پیر مرد کا غائب ہو جانا، صبح کو دفتر میں آنا پھر شام کو آنے کا وعدہ کر کے جانا اور پھر کبھی نہ آنا۔ جب میں یہ قصہ بیان کر رہا تھا

تو دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں صاحب حیران ہو ہو کر ایک دوسرے کی صورت دیکھتے جاتے ہیں اور اُن دونوں کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے بھی ہوتے جاتے ہیں۔

"کس وقت وہ دفتر میں آئے تھے اور کیا گفتگو کی تھی انہوں نے؟ ذرا مفصّل فرمائیے" حضرت مولانا نے سوال کیا۔ میں نے وقت بھی بتا دیا اور لفظ بہ لفظ گفتگو بھی دُہرا دی۔

"ذرا اُن کا حلیہ تو پھر بیان کیجئے" اڈیٹر صاحب نے فرمائش کی۔

میں نے حُلیہ بھی مفصّل دُہرایا۔

"کیا سمجھے آپ" مولانا نے اڈیٹر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ کیا سمجھے؟" اڈیٹر صاحب نے مولانا سے مخاطب ہو کر کہا

"عجیب"! مولانا نے فرمایا۔

"عجیب"! اڈیٹر صاحب نے فرمایا

میں حیران ہو کر دونوں کا مُنہ تک رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے شب میں بدہضمی کی وجہ سے خلل دماغ کا دورہ

ہوتا ہے تو اِن دونوں کو دن میں بھی یہ شکایت لاحق ہو جاتی ہے!! ـــــــ

میں نے کہا "کچھ تو فرمائیے، یہ اشارے کنائے کیسے؟"

"کہہ دو" مولانا نے اڈیٹر صاحب سے کہا،

"کہہ دوں؟ اڈیٹر صاحب نے مولانا کو جواب دیا ـــــــ

اڈیٹر صاحب سنبھل بیٹھے، انہوں نے کہا "سنئے جناب یہ عجیب و غریب واقعہ ہے۔ جو واقعہ آپ نے سنایا بالکل یہی واقعہ مجھ پر گزر چکا ہے، مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میرے پاس بھی وہ پیر مرد ٹھیک اُسی شب میں اُسی وقت آئے تھے۔ جس وقت وہ آپ کے پاس آئے تھے، اور پھر اِسی طرح کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی ہوتے غائب بھی ہو گئے تھے ـــــــ مگر عجیب تر جو بات ہے وہ یہ ہے کہ صبح کو بھی وہ میرے دفتر میں ٹھیک اُسی وقت اور اسی طرح آپ کے دفتر میں، وہی باتیں اُنہوں نے مجھ سے کیں جو آپ سے کیں، اسی طرح مجھ سے وقت مقرّر کرا کے گئے۔ جس طرح آپ سے ...... اور یہ تو ارد تو دیکھئے کہ میں نے

بھی اُسی دن وہی وقت مقرّر کیا جو آپ نے مقرر کیا تھا۔ مگر وہ پھر آج تک لوٹ کر نہ آئے۔ جس طرح آپ منتظر ہیں بھی سراپا انتظار ہوں! ——— اتنا کہہ کر اڈیٹر صاحب نے رومال سے چہرہ کا پسینہ خشک کیا پھر فرمانے لگے:۔

"یہ واقعہ دوسرے ہی دن میں نے مولانا سے بیان کر دیا تھا ——— پوچھئے مولانا سے ——— میرے آپ کے درمیان ایک خفیف جزو کا بھی کوئی اختلاف نہیں! ——— عجیب، عجیب!! ———

~~~~~~~~~~~~~~~~

ہم تینوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے ——— میں نے کہا "تصوّر اور توہّم کے توارد کی یہ ایک عجیب مثال ہے"!

"تصوّر اور توہّم"! مولانا نے تعجّب کے لہجہ میں فرمایا۔ "تصوّر اور توہّم! آپ اس واقعہ کو تصوّر اور توہّم سمجھ رہے ہیں نہیں صاحب! نہیں! نہ یہ تصوّر ہے نہ توہّم نہ توارد! روحانیات کی ایک ماورائے عقل وفہم کار فرمائی ہے! آپ تو مادّہ پرست ہیں
~~~~~~~~~~~~~~~~

روح کے ان معجزات اور تصرفات کو کیا خاک سمجھیں گے۔ لیکن آپ کو قائل ہو جانا چاہیئے ——— اب تو قائل ہو جانا ہی چاہیئے کہ اس عالم ظاہر کے علاوہ کوئی باطن بھی ہے جہاں ایسی باتیں بالکل ناممکن ہیں ———"

میں نے کہا "مولانا! دماغ کی اندرونی دنیا میں ایسے عجائبات کا ظہور ناممکن نہیں۔ اس علم کے ماہرین، اس قسم کے واقعات پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں ———"

"خدا کے لئے حضرت!" مولانا نے بگڑ کر فرمایا ——— "ماہرین اور مبصرین کا ذکر چھوڑیئے۔ ان کم بختوں نے زندگی تلخ کر دی ہے، روز کلیات قائم کرتے ہیں، روز ان کو توڑتے ہیں، دیواریں بناتے ہیں اور گراتے ہیں۔ عقل کے چکر نے ان کو گھن چکر بنا دیا ہے۔ "روحانیات" کی لطیف دنیا میں جو کچھ ہوا کرتا ہے اور ہو سکتا ہے اس کو یہ احمق کیا جانیں ———"

میں نے کہا "خاک ڈالئے اس بحث پر۔ مگر یہ تو بتائیے کہ وہ خواجہ خضر جنہوں نے مجھے بھی سوتے سے جگایا اور اڈیٹر صاحب کو بھی بیک وقت ——— حالانکہ میں اور یہ اس وقت ایک دوسرے سے کم از کم ۵ میل کے فاصلہ

پرسو رہے تھے ——— اور پھر وہ دن میں بھی بہ یک وقت دونوں کے پاس آئے اور پھر بلا وجہ غائب ہو گئے اور کبھی واپس نہ آئے ——— آخر چاہتے کیا تھے۔ کوئی اُن کا مقصود بھی تھا یا محض دل لگی تھی؟ ———

"کوئی پیام لائے ہوں گے، کوئی بات کہنا چاہتے ہونگے، یا محض اپنی صورت دکھا کر تمہیں متنبہ کرنا چاہتے ہوں گے ——— یا کوئی اور منشا ہوگا ——— کیا معلوم کسی کو!" مولانا نے میرے اعتراض کا ——— اپنے خیال میں بہت ہی مختصر جواب دیا۔!! ———

بحث کچھ اور بڑھتی لیکن پاس کی مسجد سے اذان کی آواز آئی اور مولانا نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ———

میں اور اڈیٹر صاحب راستے بھر یہی ذکر کرتے ہوئے آئے ——— وہ بھی حیران، میں بھی حیران! "کچھ بھی ہو" میں نے کہا "وہ پیر مرد ہیں بہت ہرجائی!" ———

——— ❊ ———

کباڑ کی کوٹھڑی

"بلا گرداں" صاحب کا یہ قصہ تو کچھ زیادہ عجیب
نہیں لیکن انداز بیان بہت دلچسپ ہے۔ اس
لئے فیس داخلہ قبول کر کے صاحب موصوف
کو انجمن کی رکنیت میں شامل کیا جاتا ہے۔

غدر سے پہلے دادا صاحب مرحوم نے وہ مکان بنایا تھا۔
جس میں ہم رہتے ہیں ــــــــ پرانا ہے مگر بہت مضبوط ہے!
جب غدر شروع ہوا تو دادا صاحب ایک بڑے سرکاری عہدہ پر
فائز تھے، مگر آخر میں اُنہوں نے پھانسی پائی! کوئی پولیس والا
نہ سُن لے) الزام یہ تھا کہ انہوں نے ایک بھاگے ہوئے دلّی
کے شہزادے کی مدد کی تھی۔ وہ بے چارے تو پھانسی پر لٹکے
اور اِدھر اُن کی ساری جائداد اور املاک بحقِ سرکار ضبط ہو گئی،
ہمارا مکان بھی ضبط ہو گیا۔ دادی بے چاری اس طرح گھر سے
نکلیں کہ صرف ایک چادر اُن کے سر پر تھی!! ــــــــ

دار و گیر کا زمانہ گزر گیا۔ دادی ہماری بڑی اولوالعزم عورت
تھیں، کم عمری میں بیوہ ہو کر بھی وہ مصائب سے گھبرانے والی
نہ تھیں۔ ڈولی میں بیٹھ کر بڑے صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئیں
اور جو کچھ کہنا سُننا تھا صاف صاف کہا۔ صاحب نئے نئے ضلع

ہیں آئے تھے، انہوں نے جو تحقیقات شروع کی تو ثابت یہ ہوا کہ دادا صاحب نے بے گناہ پھانسی پائی!! عجلت میں پھانسی پر چڑھا دئے گئے! ——— اُس زمانہ میں کالے آدمی کی جان کی قیمت صرف اتنی تھی کہ جب یہ حقیقت واضح ہوئی تو سرکار نے بڑا اکرم کیا جو کچھ ضبط کیا تھا اس کا نصف واپس کر دیا! دادی نے کہا، چلو، بھاگتے بھوت کی لنگوٹی، یہی غنیمت ہے، دو سال بعد پھر اپنے بچّوں کو لے کر گھر آئیں ——— جس وقت گھر بند ہوا تھا تو اوپر کی منزل پر ایک کوٹھڑی تھی اس میں سارے گھر کا کاٹ کباڑ ڈال دیا گیا تھا۔ کوٹھڑی کا ایک ہی دروازہ تھا۔ اس میں تالا پڑا ہوا تھا۔ گھر میں واپس آنے کے بعد بھی وہ تالا اسی طرح پڑا رہا ——— یہ سارا قصّہ اُس زمانے کا ہے جب میں تو کہاں، میری ماں بھی غالباً پیدا نہ ہوئی تھیں!! یہ نہ سمجھئے کہ میں چشم دید بیان کر رہا ہوں!!

میری پیدائش کے پندرہ برس بعد تک اس کوٹھڑی میں بدستور تالا پڑا ہوا تھا۔ ایک گناہگار کے سینہ کی طرح اس کے اندر روشنی جانے کا کبھی کوئی راستہ نہ کھلا! مجھے یاد ہے کہ

"دادی اماں" اس کوٹھری کے متعلق عجب عجب قصے سنایا کرتی تھیں۔ میں جب ۱۲ برس کا تھا تو دادی اماں کی عمر ۸۰ برس کے قریب تھی۔ وہ فرمایا کرتی تھیں کہ جب غدر میں ہم لوگ اس مکان سے نکالے گئے اور دو برس تک یہ مکان خالی پڑا رہا تو اس زمانہ میں ایک بہت نیک خیال جن اس کوٹھری میں آکر رہنے لگے اکثر صبح کو اُن کے قرآن شریف پڑھنے کی آواز آتی ہے اور مجھ پر تو اس قدر مہربان ہیں کہ جب کبھی میرا دل گرم گرم مٹھائی یا تازے پھل کھانے کو چاہتا ہے، فوراً بھیج دیتے ہیں!!

——— میں بچہ تو تھا لیکن اُنیسویں صدی عیسوی کا بچہ تھا! یہ قصے سنتا تھا اور "دادی اماں" کو اس قدر چھیڑتا کہ وہ چڑ جاتی تھیں ——— "کیوں دادی اماں، یہ تمہارے دوست جو اوپر کوٹھری میں رہتے ہیں مٹھائی تو لاتے ہیں، کیا ہمارے لئے کرکٹ کا ایک بلا نہ لادیں گے؟ اجی دادی اماں! آپ ذرا اُن سے کہئے تو" ——— "کیوں دادی اماں، بھلا یہ جن صاحب اس کوٹھری میں رہتے ہیں تو پاخانہ پیشاب بھی اُسی کے اندر کرتے ہوں گے ——— بڑے غلیظ ہیں وہ!" ——— "دادی اماں" کو غصہ آجاتا تھا

کہتی تھیں" توبہ توبہ کر لڑکے! وہ خدا کے نیک بندے ہیں، ہمارے مہمان ہیں، ایسی باتیں کرتا ہے تو اُن کے متعلق ــــــــ"

میں کہتا۔" دادی اماں! وہ اڑتے بھی تو ہوں گے ــــــــ ہم نے سُنا ہے کہ سب جن اُڑتے ہیں ــــــــ بھلا اُن سے کہئے ایک دن ہم کو اُڑا کر دِلّی لے چلیں ــــــــ حضرت سلیمان کی قسم دے دیجئے گا تو ضرور مان جائیں گے"!

دادی اماں دِق ہو جاتیں تو اپنی لاٹھی اُٹھا کر مجھے ڈراتیں ــــــــ "نہیں جائے گا تو، نہیں جائے گا تو؟ بکے جائے گا، بکے جائے گا؛ اچھا ٹھہر تیرے مولوی صاحب آئیں تو دیکھ میں کیسا کچھ پٹوا تی ہوں ــــــــ"

کبھی" دادی اماں" چند چراغ جلا کر ــــــــ شام کے وقت ــــــــ اس کوٹھڑی کے دروازہ پر رکھ دیتیں اور سب سے کہتیں" دیکھو بچّو اس وقت غل شور نہ ہونے پائے۔ آج جنّات جمع ہیں میلاد شریف کی محفل ہو رہی ہے ــــــــ"

میں کہتا" دادی! یہ کیسا میلاد شریف ہے، کوئی آواز تو آتی ہی نہیں! وہ فرمایئں، جا بھاگ! بچوں کو آواز نہیں آیا کرتی! ــــــــ"

ایک رات کو ــــــــ جاڑوں کا زمانہ تھا ــــــــ

ہم سب دالان میں سو رہے تھے، دالان کے سب دروازے بند تھے۔ دادی اماں کے پلنگ کے پاس ہی میرا پلنگ تھا یکایک میری آنکھ کھُلی، یہ معلوم ہوا جیسے کوئی میرے پلنگ پر کودا ہو، ڈر کے مارے میری چیخ نکل گئی سب لوگ جاگ اُٹھے، دیکھا تو ایک سفید رنگ کا بلّا تھا —— معلوم نہیں کدھر سے آ گیا —— تھا بہت بڑا، بکری کے بچّے کے برابر۔ وہ تو ہم لوگوں کے جاگنے کے بعد کسی طرف سے نکل گیا۔ مگر دادی امّاں نے صبح تک کسی کو اپنی باتوں سے سونے نہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اوپر والے جِنّ اس وقت بلّے کی صورت میں آئے "معلوم نہیں مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے" بار بار دادی امّاں فرماتی تھیں!! —— غرض یہ کہ صبح سے دوپہر تک سارے محلّہ میں، دادی امّاں نے خبر کر دی کہ اب تو کوٹھڑی والے جِنّ خود ہی اُن کے پاس آنے لگے ہیں!! میں کہتا دادی امّاں آپ نے اس وقت اُن کی دُم نہ پکڑ لی، جانے کیوں دیا؟ وہ مجھے جھڑک دیتیں "چُپ، بدتمیز!" —— جن صاحب کے آنے جانے کا سلسلہ بھی عرصہ تک جاری رہا، ایک رات کو میری ایک پھوپھی جو اُسی دالان میں سو رہی تھیں، سوتے سوتے کسی ضرورت

سے اٹھیں تو انہوں نے دیکھا کہ "دادی اماں" اپنے پلنگ پر نہیں ہیں باہر نکلیں تو دیکھا کہ وہ صحن میں کھڑی بلّے سے کھیل رہی ہیں۔ "دادی اماں" نے کہا کہ رات بلّے نے ان کو سونے نہ دیا تو ایک دفعہ غصّہ میں آکر وہ اس کی کمر پر سوار ہو گئیں، بلّا ان کو لے کر بھاگا ـــــ صحن سے اُس نے جست کی تو سامنے کی دیوار پر پہنچا تو سامنے کی دیوار سے جست کی تو کوٹھڑی کی چھت پر پہنچ گیا۔

ـــــ وہاں سے جست کی تو پھر صحن میں ـــــ

اور دادی اماں برابر اس کی کمر پر جمی رہیں!! ـــــ

میں نے جو یہ قصہ سنا تو خوب تالیاں بجائیں ـــــ

دادی اماں بہت ناراض ہوئیں، مگر میں کئی راتیں اس فکر میں جاگتا رہا کہ اگر سفید بلّا آجائے تو میں بھی ضرور اُس کی کمر پر بیٹھ ہی تو جاؤں!!

"دادی اماں! تم اُن سے کہو" میں نے کہا کہ روز ہمیں سواری دے جایا کریں، آہاہا کیا مزے کی سواری ہو گی!"

ـــــ اس آہاہا کے جواب میں دادی اماں کا ڈنڈا میری کمر کی طرف آیا ـــــ اور میں بھاگا! ـــــ

غرضکہ جب تک دادی اماں زندہ ہیں وہ ضرور "جن صاحب"

کا کوئی نہ کوئی نیا قصّہ سُنایا کرتیں اور میں ضرور کوئی نہ کوئی فقرہ چُست کرتا —— کبھی کبھی ایک دو ڈنڈے بھی کھاتا —— پھر میں اسکول میں داخل ہو گیا اور چند ہی روز بعد "دادی اماں" کا انتقال ہو گیا —— اس کے بعد سے "جن صاحب" بھی غائب ہو گئے۔ کم از کم کوٹھری میں اُن کی موجودگی کے آثار نظر نہ آتے تھے، نہ گرم گرم مٹھائی تھی، نہ سفید بلّا تھا۔ نہ قرآن شریف پڑھنے کی آواز تھی!! —— ممکن ہے کہ وہ دادی اماں کے ساتھ ہی ساتھ رخصت ہو گئے ہوں

بچپن کی ناسمجھی، نوجوانی کی شرارتوں میں بدل گئی میں اسکول سے فارغ ہو کر کالج میں داخل ہوا —— جوانی دیوانی ہونے لگی —— والد نے جو یہ رنگ دیکھا تو میری شادی کا اہتمام شروع کر دیا۔ رشتہ بچپن ہی سے قائم ہو چکا تھا، میری منگنی اس وقت ہو گئی تھی جب میں ۵ برس کا اور میری بیوی صرف ۲ برس کی تھیں!! —— غرض یہ کہ میں نے کچھ انکار بھی کیا، مگر کون سنتا ہے، پکڑ دھکڑ کے یہ بیل آخر کار زندگی کے ہل میں جوت

ہی دیا گیا!! ——— ہمارا خاندان مولویوں کا خاندان تھا، اس لئے شادی بہت سادہ اور شرعی قسم کی ہوئی۔ شام کو بارات گئی، شب بھر ہم سسرال میں پڑے رہے۔ دوسرے دن شام تک بیوی کو لے کر گھر آئے ——— لیکن واقعات کے سلسلہ کو توڑ کر پہلے اُس کوٹھری کے متعلق تھوڑا سا قصّہ بیان کر دوں ———

جب شادی کا اہتمام شروع ہوا تو والد سے میں نے کہا کہ زنانہ مکان کی بالائی منزل پر میں اپنے لئے ایک ہوادار کمرہ بنوانا چاہتا ہوں اور کمرہ کے لئے بہترین جگہ وہی ہے جہاں وہ پرانی کوٹھری ہے۔ والد نے فرمایا کہ بیٹا! تمہاری دادی نے کبھی اُس کوٹھری کے تالے کو ہاتھ نہ لگنے دیا۔ اُن کے بعد بھی میں نے اُس کوٹھری کو بدستور بند چھوڑ دیا ——— بہتر ہو کہ اس کو یوں ہی چھوڑ دو اور کسی اور طرف اپنے لئے کمرہ بنوالو میں نے کہا۔ اب تو یہ سب باتیں فضول ہیں ——— اگر کبھی کوٹھری میں کوئی جن یا بھوت تھا بھی تو وہ بھی اب باقی نہیں، کیا فائدہ کہ کوٹھری کو بند رکھا جائے اور اس قدر ہوادار موقع کو چھوڑ کر دوسری طرف کمرہ بنایا جائے ——— والد خاموش ہو گئے ———

وہ انیسویں صدی عیسوی کے بیٹے سے اختلاف ذرا کم ہی کیا کرتے تھے!! القصہ کوٹھری کا دروازہ کھول دیا گیا، غدر سے پہلے کا کاٹ کباڑ ——— ٹوٹے ہوئے پلنگ، بکس، پانی کے مٹی کے گھڑے اور خدا جانے کیا کیا، ۵۰ برس کی گرد سے ڈھکا ہوا سامان وہاں سے نکالا گیا۔ دیواریں گرا دی گئیں۔ اور اُسی جگہ نیا کمرہ تعمیر ہو گیا

میری ازدواجی زندگی کی یہ پہلی شام تھی وہ شام جس کے متعلق شاعر گیت گاتے ہیں!! دُلہن اسی کمرہ میں بٹھائی گئی تھی، میری بہنیں اُس کے پاس بیٹھی تھیں، کمرہ میں پرانی وضع کی ہانڈیاں لٹک رہی تھیں، دیواروں پر دیوارگیر فانوس لگے ہوئے تھے۔ اسی منزل پر ایک دوسرا کمرہ میری نشست گاہ تھا۔ مغرب کے وقت مجھے وہاں سے بلایا گیا۔ اور کہا گیا کہ ان فانوسوں اور ہانڈیوں کی موم بتیاں روشن کردوں ——— دُلھن ایک چاندی کے پلنگ پر سر جھکائے گھونگٹ نکالے بیٹھی تھی۔ اس کے پلنگ کے پاس ایک کرسی رکھ کر میں کرسی پر چڑھا تاکہ ہانڈی کی بتی کو روشن کردوں۔ دیا سلائی جلا کر میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دفعتاً یہ معلوم ہوا کہ کسی

نے میرے پاؤں کے نیچے سے کرسی کو کھینچ لیا اور میں بے قابو ہو کر دلھن کے پلنگ پر گرا ——— کچھ یوں ہی چوٹ بھی آئی اور خیال یہ ہوا کہ کسی بہن نے شرارت کر کے مجھے گرایا۔ ایک شریر بہن ——— خدا مغفرت کرے ——— ہنسنے لگی ———

"واہ بھائی واہ! اس قدر بے صبری تمہیں اس پلنگ پر بیٹھنے سے منع کس نے کیا تھا جو یہ بہانہ نکالا!" اب تو یقین ہو گیا کہ شرارت کی گئی ——— پھر کرسی پر چڑھا اور پھر دیا سلائی جلا کر موم بتی جلانے کا ارادہ کیا ——— اور پھر وہی حادثہ پیش آیا، اس دفعہ کچھ چوٹ بھی زیادہ لگی ——— مگر عجب بات یہ تھی کہ کرسی بدستور اپنی جگہ پر موجود تھی! حالانکہ مجھے صاف یہ محسوس ہوا تھا کہ کرسی ہٹائی گئی

"یہ کیا بے موقع مذاق ہے"؟ میں نے بگڑ کر کہا ———

——— میری بہنوں نے قسمیں کھائیں کہ انہوں نے کوئی شرارت نہیں کی ——— پھر میں کرسی پر چڑھا، دیا سلائی جلا کر ہاتھ میں نے بتی کی طرف بڑھایا لیکن نیچے کی طرف بھی دیکھتا رہا ——— سب لڑکیاں کرسی سے کافی فاصلہ پر بیٹھی ہوئی تھیں ——— مگر پھر میں گرا اور اس دفعہ بالکل دلہن کے اوپر!! ——— جھلا کر میں نے دیا سلائی کی ڈبیا

پھینک دی اور باہر چلا گیا۔

اُسی شب کو نو بجے کے قریب میں پھر اندر گیا، میری بہنیں سب جا چکی تھیں۔ میری بیوی کے پاس صرف ایک ماما بیٹھی ہوئی تھی، وہ بھی اُٹھ کر چلی گئی۔ میں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور ایک دروازہ کے پاس آرام کرسی بچھا کر حقہ پینے لگا۔۔۔۔ گلابی جاڑوں کا موسم تھا۔ کمرہ کے تین دروازے تھے، دو بند تھے کمرہ کے سامنے غسلخانہ تھا، میری بیوی غسلخانہ جانے کے لئے اُٹھیں اور میری کرسی کے سامنے سے گزر کر باہر چلی گئیں، چند منٹ بعد وہ واپس آئیں تو میں نے اُن سے کہا کہ دروازہ بند کرتی آؤ۔ اُنہوں نے چوکھٹ سے گزر کر بغیر مُنہ موڑے ایک ہاتھ سے کواڑ بند کر دیا اور ساتھ ایک قدم آگے بڑھیں اگر وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ گئیں ہوتیں تو معلوم نہیں کس قدر زخمی ہوتیں اس لئے کہ کواڑ بند ہوتے ہی یہ معلوم ہوا کہ گویا باہر سے کسی نے دونوں کواڑوں پر پوری قوت سے ایک لات ماری۔ اور کواڑ دفعتاً کھُل گئے، خیریت گزری کہ میری بیوی ایک چشم زدن پہلے اُن کی زد سے نکل چکی تھیں! پھر وہ دھڑاکے

کی آواز ــــــــ سارا مکان گونج گیا! ــــــــ
میں گھبرا کر اُٹھا۔ سمجھا کہ آندھی کا کوئی جھونکا آیا، آسمان کی طرف دیکھا تو بالکل صاف تھا، چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ سامنے کی چھت بہت وسیع تھی ــــــــ خیال آیا کہ شاید نیچے کی منزل سے کسی شریر لڑکی نے آ کر یہ مذاق کیا ہو ــــــــ
لیکن زینہ اس قدر دُور تھا ــــــــ اور بالکل سامنے کہ کتنا ہی تیز کوئی آتا جاتا، چھپنا مشکل تھا اور پھر اس کھلی ہوئی چاندنی میں!! ــــــــ چھت پر ایک چکّر لگا کر میں واپس آیا ــــــــ کوئی بات سمجھ میں نہ آئی، ــــ
بہر حال کواڑ اندر سے بند کر کے اور ۱۱ بجے کے قریب سو گیا ــــــــ میری آنکھ جھپکے شاید دس پندرہ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ پھر دروازہ پٹنا شروع ہوا گھبرا کر اٹھا، دروازہ کھولا، باہر گیا، ہر طرف دیکھا ــــــــ
چاندنی کھلی ہوئی تھی، ساری چھت صاف تھی، ہوا کا نام نہ تھا کوئی ایسا راستہ نہ تھا کہ غیر شخص آ سکتا، زینہ کا دروازہ میں نے پہلے ہی اندر سے بند کر لیا تھا، وہ بدستور بند تھا ــــــــ
پھر سو گیا، ذرا آنکھ لگی تھی کہ پھر کواڑ پٹنے شروع ہوئے، پھر

اٹھا پھر سویا، پھر جاگا ——— رات بھر اسی طرح چوکیداری
کرتے گزری، جب تک جاگتا رہتا تھا کوئی کھٹکا نہ ہوتا تھا۔
جہاں آنکھ لگی اور کواڑ پٹنے شروع ہوئے !!

ساری رات تو اسی طرح گذر گئی، بیوی سے میں نے منع کر دیا
کہ اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ دوسرے دن کمرہ کے
باہر برآمدہ میں، دروازہ کے پاس دو کتے باندھے گئے۔
زینہ کا دروازہ بند کر کے تالا ڈالا گیا۔ بارہ بجے تک میں بیٹھا ہوا
بیوی سے باتیں کرتا رہا ——— وہ ڈر تو بہت رہی تھیں
لیکن اپنا خوف ظاہر نہ ہونے دیتی تھیں ——— باتیں
کرتے کرتے ہم لوگ سو گئے ——— پندرہ ہی
منٹ کے بعد پھر کواڑ پٹنے شروع ہوئے اور یہی حال رات
بھر رہا۔ کتے دروازہ کے سامنے بیٹھے تھے اور صرف اسی وقت
بھونکتے تھے جب کواڑ پٹنے کی آواز شروع ہوتی تھی !
یقیناً وہ کسی کو دروازہ کے پاس آتا دیکھتے تھے !!
پھر یہ معمہ کیا تھا ؟

ایک دن، دو دن، چار دن، ——— ایک ہفتہ اسی

طرح گذر گیا۔ رات کی نیند حرام ہو گئی۔ میں نے اور میری بیوی نے بہت اس قصہ کو چھپایا، لیکن کہاں تک، بہنوں تک بات پہنچی، پھر والدہ کو معلوم ہوا، پھر والد کے کان تک سارا قصہ پہنچا اور ہوتے ہوتے، ہماری ساس کو خبر لگی ——— وہ بے چاری پرانے زمانہ کی بڑی بی، سنتے ہی ڈولی پر چڑھ کر دوڑیں ——— سارے گھر میں قیامت آگئی۔

«غضب خدا کا! پہلے دن سے یہ ظلم ہو رہا ہے۔ میری بچی کو مار ڈالنے کا ارادہ ہے کچھ؟ اور یہ میاں لڑکے تو پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ داماد پاگل ملا ہے!

——— بند کرو اس کمرہ کو، صاحب زادے نیچے کی منزل میں رہنا چاہیں تو رہیں نہیں میں تو اپنی بچی کو گھر لیئے جاتی ہوں۔ کیا کہا؟ نیچے تکلیف ہو گی؟ کیا تکلیف ہو گی؟ تمہارے باپ دادا سب یہیں رہے، تم یہیں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی۔ ——— ہمیشہ کمرہ پر ہی تو رہا کرتے تھے گویا!!

——— چلو، جھک جھک نہ کرو ——— وہیں رہو گے ——— تو رہو، میں تو اپنی بچی کو لئے جاتی ہوں ——— اللہ بچائے آج کل کے لڑکوں سے ———

دیدہ کی صفائی تو دیکھو ــــــــ جنات سے مقابلہ کریں گے یہ!! اپنی دادی کی باتوں پہ ہنسا کرتے تھے ــــــــ اُس وقت تو میاں بالشت ہی بھر کے تھے ــــــــ اب مجھ سے دل لگی کرنے لگے!! ــــــــ جو تمہارے جی میں آئے کہو!! ــــــــ"

ایک لمبا چوڑا لیکچر دے کر وہ تو میری بیوی کو لے کر گھر چلی گئیں اب اماں باوا کی یورش مجھ پر شروع ہوئی ــــــــ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کا سخت ترین مقابلہ ہوا! مگر میں نے کسی کی نہ سُنی، تنہا بھی وہیں سویا ــــــــ اتنا تو ہوا کہ ابا جان نے بغیر میری اطلاع کے دو نوکر برابر کی چھت پر بٹھا دیئے ــــــــ لیکن رات کی دھڑا دھڑ کو وہ بھی نہ روک سکے! سلسلہ جاری رہا ــــــــ میں بھی اپنے سرہانے طلسم ہوشربا اور رینالڈس کے ناول رکھ کر لیٹتا تھا اور تین چار بجے صبح تک پڑھتا تھا۔ اِس لئے صبح کے قریب جب آنکھ لگتی تھی تو ایک دو دفعہ سے زیادہ کواڑ پٹنے کا موقعہ نہ آتا تھا ــــــــ اس طرح دو ہفتے گذر رہے۔ ایک دن میں نے کہا چھوڑو میں نہیں سوتا کمرہ میں، کواڑ کھول دو اور دروازہ

کے سامنے برآمدہ میں بستر بچھاؤ۔ ——— وہ شب امن سے گزری، اُس کے بعد کبھی یہ سلسلہ جاری نہ ہوا ——— بلکہ میں جب پھر اندر سونے لگا اور تب بھی وہ واقعہ پیش نہ آیا۔ ساس صاحبہ کو جب کافی اطمینان ہو گیا تو اُنہوں نے بھی بہت سے تعویذ پہنا کر اور بہت سے فلیتے کمرہ میں جلانے کے لئے ساتھ کر کے میری بیوی کو بھیج دیا ——— ۱۸ برس تک ہم اس کمرہ میں رہے، گرمی، جاڑا، برسات، تمام موسم اُسی کمرہ میں گزرتے تھے۔ میرے بچّے بھی وہیں رہتے تھے، ——— معلوم ہوتا ہے کہ دادی امّاں کے وہ روحانی دوست ناراض ہو کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے !!۔

اب یہ نہ پوچھئے کہ میری رائے کیا ہے۔ اور اس سارے واقعہ کی اصلیت مَیں کیا سمجھتا ہوں !! جنّات کے متعلق بدعقیدہ میں اب بھی ہوں ! اب بھی میں اِن باتوں کو ڈھکوسلا ہی سمجھتا ہوں لیکن اگر آپ مجھ سے یہ دریافت کریں کہ آخر دو ہفتے تک میرے کمرہ کے کواڑ کون پیٹا کرتا تھا، تو میں جواب کچھ نہ دے سکوں گا !! البتہ آپ سے کہوں گا کہ جدید روحانیات کے یورپین ماہرین سے مشورہ کیجئے ! بغیر یورپین ماہرین کے مشورہ کے اِس

اُلجھنے کا بھی ـــــــــ سلجھنا مشکل ہے! تعلیم یافتہ، متمدّن اور "روشن خیال" آدمی ہوں ـــــــــ علم و سائنس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ جنّات و نات سب پُرانی بوڑھیوں کے ڈھکوسلے ہیں!

ـــــــ ـــــ

شاہ جمال

مجلس کی رائے میں "جمالی" صاحب
کا یہ بیان کافی دلچسپ ہے۔
لہذا بطور فیس داخلہ منظور کیا
جاتا ہے ؛

لوگ مجذوب کہتے تھے، میں ان کو پاگل کہا کرتا
تھا، ——— اصل نام تو اُن کا کچھ اور ہی تھا.
مگر میں ہمیشہ اُن کو "شاہ جمال" کے نام سے مخاطب کرتا تھا
——— ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں کسی ریاست میں
بہ تلاشِ روزگار مقیم تھا، لیکن کوئی اُمید نظر نہ آئی تھی، ایک دن
یہ حضرت وہاں پہنچ گئے۔ میرے ہی پاس قیام کیا
ان کا قیام بھی سفر سے بدتر ہوتا تھا، تشریح آگے کروں گا۔
——— غرض دو چار دن حسبِ عادت شہر میں چکّر
لگاتے پھرتے، ایک دن ریاست کے ایک بڑے عہدہ دار
کے دفتر میں گھُس گئے۔ چپراسی اور سپاہی ہاں، ہاں ہی کرتے
رہے اور وہ دفعتاً عہدہ دار کے کمرہ میں گھُس کر اُس کی
خالی کرسی پر جا بیٹھے ——— اور لگے احکام جاری فرمانے!!
یہ تو سب نے سمجھ لیا کہ کوئی پاگل ہے مگر اتنی ہمت کسی کی نہ

ہوئی کہ زبردستی اُن کو کُرسی پر سے گھسیٹ لیتا۔ صاحب کرسی اُس وقت تک دفتر میں تشریف نہ لائے تھے۔ اول تو شاہ صاحب نے پیشکار کو بلا کر حکم دیا کہ لکھو ہمارا حکم ——— جب اُس نے اس پاگل پن میں شریک ہونے سے گریز کی تو خود ہی قلم اٹھا کر آپ نے ایک حکم لکھ ڈالا ——— افسر موجودہ برخاست اور اُس کی جگہ نیا تقرّر ——— یعنی میرا! ——— نام پتہ نشان سب لکھ آئے ——— آتے ہی فرمانے لگے ——— آج تمہارا تقرّر کر دیا ہم نے! میں نے کہا ——— "شاہ صاحب! خدا جانے کہاں خاک اڑاتے پھرتے ہو اور باتیں کرتے ہو ایسی جن کا سر نہ پیر" کہنے لگے ہم تو حکم لکھ آئے!

کھانا کھا کے وہ تو مجھ سے ایک روپیہ لے کر ——— اس کی تشریح بھی بعد میں کی جائے گی ——— پھر گشت کرنے نکل گئے۔ میں تھوڑی دیر قیلولہ کرنے کے لئے لیٹا۔ ذرا آنکھ ہی لگی تھی کہ کسی نے مجھے ہوشیار کیا۔ دیکھتا ہوں تو وزارت کا ہرکارہ کھڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ مجھے رئیس نے یاد فرمایا ہے۔ ——— قصہ مختصر یہ کہ اُسی دن اور اُسی عہدہ پر جس کی

خبر شاہ صاحب لائے تھے میرا تقرر ہوگیا ——— ہز ہائی نس کسی وجہ سے ناراض ہوئے اور موجودہ عہدہ دار کو انہوں نے یکایک برطرف کر دیا ——— اس واقعہ کا بڑا چرچا ہوا ہز ہائی نس کے کان تک یہ قصہ پہنچا، اُن کو شاہ صاحب سے ملنے کا شوق پیدا ہوا ——— شاہ صاحب کہاں ہاتھ آتے ہیں ——— دس پندرہ دن کے بعد معلوم ہوا کہ بمبئی میں چوپاٹی پر گھوم رہے تھے، پھر چند روز بعد معلوم ہوا کہ اپنے وطن پہنچ گئے ——— اب شاہ صاحب کا تھوڑا سا حال بھی سن لیجئے۔

میرے وطن میں علماء کے ایک بہت مقدّس خاندان کے رُکن تھے، خود بھی عالم و فاضل آدمی تھے، درس نظامی کی تکمیل کر چکے تھے، فارسی خوب بولتے اور لکھتے تھے، اور طب کی تمام ضروری کتابیں بھی پڑھ چکے تھے۔ علم و فضل اور زہد و اتّقا کی دولت کے علاوہ دولت دنیا سے ہمیشہ محروم رہے۔ ابتدائی عمر میں لڑکے پڑھاتے تھے، بعد کو ایک بیوہ بیگم صاحب کے مختار عام اور مہتمم جائداد ہو گئے تھے، غالباً ۵۰ روپیہ مہینہ پاتے تھے، جنون

مراق یا اسی قسم کے کسی دماغی مرض کا کوئی اثر خاندان میں نہ تھا، وہ خود نہایت پرہیزگار اور بہت سنجیدہ مزاج آدمی تھے، سفید براق داڑھی۔ پستہ قد، تسبیح ہاتھ میں ——— یہ اُن کی وضع قطع تھی۔ میں اپنی نوعمری کے زمانہ میں اکثر ان کو جاتے آتے دیکھا کرتا تھا، سلام دُعا بھی ہوتی تھی، لیکن اس سے زیادہ مراسم کچھ نہ تھے ——— اُن کا جوان لڑکا یکایک پاگل ہوگیا، اس پر جنون کے دورے بہت شدید پڑتے تھے اس لئے گھر میں باندھ کر ڈال دیا گیا تھا، شاہ صاحب اس کی تیمارداری کیا کرتے تھے، ایک دن اس لڑکے نے بیٹھے بیٹھے پانی کے ایک مٹکے کی طرف اشارہ کیا اور باپ کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"ایک دفعہ سر مارتا ہوں، ٹکڑے ہو جائیں گے اس مٹکے کے، سمجھا کچھ؟ بڈھے! ——— یہ دیکھ!"

"یہ دیکھ" کہہ کر جو مٹکے پر سر مارا ہے تو اس کے چار ٹکڑے ہو گئے!!

دفعتاً شاہ صاحب کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی:۔

"اوہو! یہ کیا بہادری ہوئی! دیکھ! پہلوانی اس کو اس کو کہتے ہیں، سر مار کر دیوار گرا دیتا ہوں!"

یہ کہہ کر انہوں نے دیوار پر زور سے سر مارا۔ چوٹ تو آئی ہو گی۔ مگر سر پھٹا نہیں، نہ دیوار گری ——— البتہ دیوار تھی بہت پرانی، دو چار اینٹیں گر گئیں ———
مگر شاہ صاحب کے پاگل پن کا اسی دن سے اعلان عام ہو گیا!! ——— اب گھر میں ایک کے بجائے دو پاگل ہو گئے۔ شاہ صاحب اس پاگل پن کی حالت میں اپنی بیوی سے بہت ڈرا کرتے تھے ——— ہمیشہ ان کو ملانی بی کے نام سے یاد کرتے تھے، بڑی بی کی موجودگی میں پاگل پن کی حرکتیں کچھ کم ہو جاتی تھیں ——— ایک دن ملانی بی کی نگرانی اور نکتہ چینی سے گھبرا کر نکل کھڑے ہوئے ———
عجیب بات یہ ہوئی کہ جس دن یہ پاگل ہوئے اسی دن ان کا بیٹا بالکل صحت یاب ہو گیا اب بھی موجود ہے اور ہر طرح صحیح الحواس ہے ——— مگر شاہ صاحب اس دن سے جو بگڑے تو پھر کبھی نہ سنبھلے!!

طبعاً میں پاگلوں اور دیوانوں سے بہت خوفزدہ رہتا ہوں چنانچہ جب شاہ صاحب نے کپڑے پھاڑ کر سڑکوں پر دوڑنا

اور چیخنا چلانا شروع کیا تو میں نے اپنے ملازموں کو ہدایت کردی کہ شاہ صاحب اِدھر آئیں بھی تو میرے مکان کے اندر نہ آنے دینا —— لیکن جب سے وہ پاگل ہوئے مجھ پر خاص توجہ فرمانے لگے۔ دوسرے تیسرے دن، میرے محلہ میں اُن کا پھیرا ہوتا —— آگے آگے چلاتے، پکارتے، چیختے، شعر پڑھتے، گالیاں دیتے شاہ صاحب اور ان کے پیچھے پیچھے دس بیس لونڈے تالیاں بجاتے ہوئے اور محلہ کے دو چار کتے بھونکتے ہوئے —— اس طرح شاہ صاحب کا جلوس میرے گھر کی طرف آیا کرتا تھا! میرا یہ حال کہ جہاں میں نے ان کی آواز سنی اور مکان کے دروازے بند کرائے —— ایک دفعہ تو یہ ہوا کہ وہ کسی طرح گھس ہی آئے، میں اُٹھ کر بھاگا تو سیدھا پاخانہ میں —— اندر سے کر لئے کواڑ بند۔ اب شاہ صاحب میری نشست کے کمروں میں دوڑ رہے ہیں —— قلم دوات کو خراب کیا، کاغذات پھاڑ ڈالے، کتابیں نکال کر پھینک دیں، دو چار اُردو فارسی کی کتابیں بغل میں دبائیں، دو چار تصویریں دیواروں پر سے اتار کر پھاڑ ڈالیں —— دو گھنٹے تک اُنہوں نے مکان میں یہ ہنگامہ برپا رکھا اور میں پاخانہ میں

چُھپا بیٹھا رہا!! ــــــــــ اس قدر خوف زدہ تھا کہ ایک دفعہ تو اُن کو پاگل خانہ میں داخل کرانے کی کوشش بھی کی ــــــــــ شاہ صاحب کو دو باتوں کا بہت شوق تھا ــــــــــ ایک تو موٹر میں سوار ہونے کا اور دوسرے خطوط لکھنے کا۔ کسی کی موٹر جاتی ہو کسی نہ کسی طرح اس میں سوار ہو جاتے تھے ــــ اور دُنیا بھر کے نام خطوط لکھے جاتے تھے ــــــــــ کبھی کسی والیٔ ریاست کے نام، کبھی وائسرائے کے نام، کبھی اپنے کسی عزیز کے نام اور کبھی ملّانی بی کے نام!!

ایک دن میں گھر سے باہر جانے والا تھا، میری موٹر مکان کے دروازہ پر کھڑی تھی۔ خیال وگمان بھی نہ تھا کہ شاہ صاحب اس طرح چُپ چُپاتے آجائیں گے۔ لیکن جیسے ہی میں نے موٹر میں قدم رکھا شاہ صاحب بھی نمودار ہو گئے اور بِلا تکلف موٹر میں سوار ہو گئے۔ پہلے تو میرا ارادہ ہوا کہ بھاگوں، ایسا نہ ہو کہ یہ مار بیٹھیں یا کاٹ کھائیں۔ پھر یہ دیکھ کر سڑک پر بہت سے لوگ کھڑے ہیں اپنی بُزدلی کا عملاً اظہار کرتے ہوئے شرم آئی۔ اب میں نے چاہا کہ شاہ صاحب سے ایسی باتیں کروں کہ یہ خفا

نہ ہونے پائیں۔ میں نے کہا "شاہ صاحب! کہیں ہوا خوری کیلئے چلئے گا؟" اُنہوں نے فرمایا "چلو، ذرا جنگل کی طرف چلیں!" جنگل کے نام سے میرا خون اور بھی خشک ہوا۔ خیر، اپنے شوفر کی موجودگی سے کچھ ہمّت بندھی ہیں نے کہا چلئے چنانچہ موٹر شہر کے باہر ایک سبزہ زار میں جاکر ٹھہرائی گئی۔ شاہ صاحب نے کہا آؤ ذرا ٹہلیں ــــــ میری یہ حالت کہ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے، لیکن ڈرتا تھا کہیں مزاج برہم نہ ہو جائے، اس لئے شوفر کو اشارہ کیا کہ وہ بھی ساتھ ساتھ آئے!! شوفر نے بھی اندازہ کرلیا کہ آج اُس کے آقائے نامدار کا حال بہت پتلا ہے!

ــــــ بہرحال کچھ دور جاکر شاہ صاحب سبزہ زار پر بیٹھ گئے ــــــ میں بھی بیٹھ گیا ــــــ نہ بیٹھتا تو کرتا کیا!! ــــــ دو گھنٹہ تک ہم دونوں وہاں بیٹھے رہے، شاہ صاحب کو فارسی اشعار ہزارہا یاد تھے، سُنانے جو شروع کئے تو تھوڑی دیر بعد میں اُن اشعار کی لذّت میں اپنے خوف کو بھول گیا۔ ایک سے ایک بہتر شعر وہ سُنا رہے تھے اور میں مزے لے رہا تھا ــــــ سارا سماں بدل گیا، ساری فضا بدل گئی!! ــــــ اب جو ہم وہاں سے اُٹھے

تو خوف کا اثر میرے قلب پر کچھ یوں ہی سا باقی تھا
بلکہ شاہ صاحب کے لئے اپنے اندر ایک عجیب کشش پاتا تھا۔

——— وہ دن ہے اور آج کا دن،

شاہ صاحب سے خوف زدہ ہونے کا تو ذکر ہی کیا میں اکثر اُن کو ڈانٹ ڈپٹ لیتا تھا۔ جہاں اُنہوں نے کوئی غیر سنجیدہ بات مُنہ سے نکالی، یا گالی بکی اور میں نے ٹوکا۔ "شاہ صاحب! ہائیں ہائیں! یہ کیا بے عنوانی آپ نے شروع کی؟"
میرے یہ کہتے ہی وہ سنبھل جاتے تھے۔ اکثر اُن کے سخت طیش اور غصہ کی حالت کو میں دو منٹ میں ٹھنڈا کر دیا کرتا تھا۔ میری مجلس میں کبھی کوئی شخص اُن کو اتنا دق کرتا تھا کہ غصہ آجائے تو غصہ کو ضبط کر کے کہا کرتے تھے "بھئی میں ان سے ڈرتا ہوں اس لئے کچھ نہیں بولتا!" ———

جنون کی شدت میں داڑھی بھی کٹوا دی تھی اور اکثر کپڑے بھی اتار کر پھینک دیتے تھے لیکن جب سے میرے اُن کے مراسم پیدا ہوئے کبھی میں نے اُن کو برہنہ نہیں دیکھا۔ جنون کی حالت میں بھی نماز اور روزہ کی سختی سے پابندی کیا کرتے تھے اور یہ ایک عجیب بات تھی کہ جس وقت تک مصلے پر بیٹھے رہتے

جنون کے آثار بالکل مفقود ہوتے تھے ـــــــ میں اکثر مذاق مذاق میں ان سے کہا کرتا تھا، "بھئی تم مکر کرتے ہو اور دنیا والوں کو دھوکہ دیتے ہو، پاگل واگل کچھ بھی نہیں ہو، خواہ مخواہ بنتے ہو!" ـــــــ دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند پر عمل کرتے ہو شاید!" ـــــــ

میری مرحومہ بیوی زچہ خانہ میں بیمار تھیں، حالت اندیشہ ناک تو نہ تھی لیکن میں پریشان بیٹھا ہوا تھا، شاہ صاحب تشریف لے آئے ـــــــ بہت خاموش اور رنجیدہ تھے ـــــــ میں نے مزاج پوچھا کہنے لگے، طبیعت مضمحل ہے میں نے کہا۔ شاہ صاحب! میری بیوی بیمار ہیں آپ ہی کچھ دعا کیجئے جواب نہیں دیا، تھوڑی دیر میں اُٹھ کر لکھنے کی میز پر جا بیٹھے، خدا جانے کیا کیا لکھتے رہے۔ میں زنانہ مکان میں گیا تو وہ اٹھ کر چل دیئے۔ باہر آیا تو جاچکے تھے۔ میز کے پاس آیا تو میرے جاذب پر نیلی پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ "صحبت یار آخر شد!" ـــــــ تیسرے دن میری بیوی کا انتقال ہو گیا!! اس عرصہ میں وہ نہیں آئے۔ دفن کے وقت قبرستان میں

آئے۔ پھر وہاں سے میرے ساتھ گھر آئے ایک رومال میں سوکھی ہوئی ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا تھا، مجھے دیا کہ کئی وقت سے تم نے کچھ نہیں کھایا، اس کو کھاکر ٹھنڈا پانی پیو اور خدا کا شکر ادا کرو ——————

شاہ صاحب کا بہت ہی محبوب مشغلہ ——————

جس میں دن کا وہ زیادہ حصہ صرف کیا کرتے تھے یہ تھا کہ صبح کو بازار میں پہنچے اور دُکان داروں سے اُنہوں نے اپنا ٹیکس وصول کرنا شروع کیا، لوگ اُن سے ڈرتے بھی تھے اور اُن کی خاطر دارات کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے، اس لئے اُن کی فرمائش کو رد کوئی نہ کرتا تھا پہلے اُنہوں نے مٹھائی والے سے تھوڑی سی مٹھائی لی، میوہ فروش سے دو چار پھل لئے، بسکٹ والے سے دو چار بسکٹ، چنے والے سے چنے، گزک والے سے کچھ گزک، ترکاری کی دُکان سے کچھ ترکاری —————— غرض ہر چیز اُن کے کُرتہ کے دامن میں جمع ہوتی گئی، جب دامن بھر گیا تو وہ اب بازار سے محلوں کی طرف غل مچاتے ہوئے آئے، ہر محلہ کے لونڈے شاہ صاحب کی آواز پہ لگے ہوئے تھے، وہ آواز سنتے ہی جمع

ہو گئے اور پھر شروع ہوئی لوٹ! اوّل تو شاہ صاحب نے دامن کا سامان تقسیم کرنا شروع کیا، اور لونڈوں نے اُس کو لوٹنا، پھر شاہ صاحب نے گالیاں دینی شروع کیں۔ لونڈوں نے آوازے کسنے شروع کئے، دو چار نے موقعہ پا کر شاہ صاحب کے گُھٹے ہوئے سر پر دس پانچ چانٹے بھی مار دیئے ——————

گھنٹہ دو گھنٹہ یہ ہنگامہ رہا —————— اسی میں دوپہر کا وقت ہو گیا، شاہ صاحب کسی بھلے آدمی کے گھر پہنچے "کھانا کھلاؤ گے کچھ؟ کیوں بھئی کھلاؤ گے؟" اُنہوں نے بہ اطمینان بیٹھ کر ماحضر کھایا —————— عادت یہ تھی کہ ہر نوالہ پر بسم اللہ کہا کرتے تھے اور رکابی کو آخری نوالہ سے اس قدر صاف کر دیتے تھے کہ وہ بالکل دُھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ——————

کھانا کھا کر شاہ صاحب نے دوسری فرمائش کی، دو روپیہ، ایک روپیہ، آٹھ آنے، جو جی میں آیا مانگ بیٹھے، عموماً میزبان کی حیثیت دیکھ کر مانگا کرتے تھے۔ اس طرح جو کچھ بلا اُس کے اُنہوں نے پیسے بہنائے۔ وہ سب پیسے دامن میں بھر لئے گئے —————— اب پھر محلوں کا دورہ شروع ہوا پھر اُسی طرح تمام پیسے لونڈوں کو تقسیم کئے گئے ——————

کچھ لونڈوں نے چپت مارے کچھ شاہ صاحب نے گالیاں دیں چیختے چلّاتے میرے گھر آئے ——————

"ارے میاں! لونڈوں نے ہم کو بُری طرح مارا ہے، دیکھو نا، سر پر کتنا بڑا گومڑا ہے! مردود نے لکڑی ماری ——"

میں کہتا "شاہ صاحب! پھر آپ بھی تو باز نہیں آتے، لونڈوں ہی میں جا کر گھستے ہیں —————— یہ ہر روز کا پروگرام تھا!! ——————

ایک دن بعد مغرب کہیں سے آئے، میں اُس وقت زنانہ مکان میں تھا اور میری لڑکی سخت درد قولنج میں مبتلا تھی —— جب یہ معلوم ہوا کہ میں زنانہ میں ہوں تو خلافِ معمول اندر آ گئے —————— دروازہ ہی سے مجھے پکارتے ہوئے —————— ارے بھائی! خیر تو ہے، کون بیمار ہو گیا۔ —————— دوا میرے ہاتھ میں تھی، لڑکی کو میں پلانا ہی چاہتا تھا۔ کہنے لگے —————— ٹھہرو ٹھہرو! ذرا سا یہ سیب تو کھلا دو، ایک آدھا سیب اُن کے ہاتھ میں تھا، میں ذرا جُھنجلایا۔ میں نے کہا! بہت تکلیف ہے لڑکی کو شاہ صاحب اور سیب قابض ہوتا ہے، مگر شاہ صاحب نے ایک ٹکڑا توڑ کر

لڑکی کے مُنہ میں دے ہی دیا ——— بچپن سے میری لڑکی شاہ صاحب کی بہت معتقد تھی اور اُسے اعتقاد اپنی ماں سے ورثتاً ملا تھا ——— دوا چھوڑ کر اس نے وہ آدھا سیب ختم کیا اور شاہ صاحب اُس کی پائینتی بیٹھ گئے ——— میں نہیں جانتا کیونکر اور کس طرح ——— لیکن واقعہ یہ ہے کہ درد اُسی وقت رفع ہو گیا اور صبح تک لڑکی بالکل تندرست ہو گئی! ——— اب پیر پرست تو کہیں گے کہ یہ شاہ صاحب کا روحانی فیض تھا اور مجھ سے مادّہ پرست اصرار کریں گے کہ درحقیقت درد بند ہونے ہی والا تھا۔ ڈاکٹر کی دوائیں اپنا اثر کر چکی تھیں ——— شاہ صاحب کے سیب کو اس واقعہ سے کیا علاقہ!! ———

بہر حال باپ تذبذب ہی میں رہا لیکن بیٹی کی عقیدت مندی شاہ صاحب کے ساتھ ——— نرار گُنی بڑھ گئی!!

——— شاہ صاحب کو سفر و سیّاحی کا بھی بہت شوق تھا، دس پانچ دن ایک ہی جگہ ٹھہرنا ان کے لئے بہت مشکل ہوتا تھا، جس دن جی چاہا ریل کے اسٹیشن پہ پہنچے اور جو ٹرین کھڑی ہوئی ملی اُسی میں بیٹھ گئے، اس سے بحث نہیں کہ وہ

کہاں جائے گی یا شاہ صاحب کہاں پہنچ جائیں گے۔ ریلوے کے محکمہ میں شاہ صاحب خوب مشہور تھے اور ریلوے کا ہر افسران کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ریلوے کے متعلق ان کا ایک واقعہ مشہور ہے ——— کانپور کے اسٹیشن کا ایک افسرِ اعلیٰ بہت سخت مزاج تھا، شاہ صاحب بغیر ٹکٹ سفر کر رہے تھے ——— ہمیشہ بغیر ٹکٹ کے سفر کیا کرتے تھے ——— کان پور کے اسٹیشن پر پکڑے گئے اُنہوں نے حسبِ عادت بہت شور مچایا، ٹکٹ کلکٹر اُن کو اُس افسر کے روبرو پکڑ کر لے گیا، وہاں بھی اُنہوں نے وہی بے سر و پا باتیں شروع کیں، وہ غالباً یہ سمجھا کہ یہ خواہ مخواہ پاگل بن کر گلو خلاصی چاہتے ہیں ——— ——— حکم دیا کہ پولیس کی سپرد کر دو ———

اس کے کمرہ سے پولیس کے سپاہی شاہ صاحب کو پکڑ کر لے چلے ——— جاتے جاتے اُنہوں نے افسر مذکور کو مخاطب کر کے کہا ”ارے کیوں ہمیں پکڑواتا ہے، تیری ترقی کا حکم تو آگیا ——— غرض شاہ صاحب ریلوے کے تھانہ میں بٹھا دیئے گئے۔ اس واقعہ کے آدھ ہی

گھنٹہ کے بعد اُس افسر کو ایک سرکاری تار وصول ہوا جس میں اُس کی غیر متوقع ترقی کی خبر تھی ـــــــ تار پڑھ کر وہ سیدھا پولیس کے دفتر میں آیا، شاہ صاحب سے معذرت کی اُن کو اپنی کوٹھی پر لے گیا اور بہت خاطر و مدارات کی۔ ـــــــ اُس دن کے بعد سے شاہ صاحب جب کان پور کی طرف گذرتے وہ افسر شاہ صاحب کی بے حد خاطر و مدارات کرتا۔ یہ واقعہ تمام ریلوے کے محکمہ میں مشہور ہوگیا اور شاہ صاحب اس قدر مشتہر ہو گئے کہ ہر اسٹیشن پر لوگ اُن کی آؤ بھگت کرنے لگے

اسی طرح ایک دفعہ شاہ صاحب دلی کے اسٹیشن پر کسی ٹرین میں سوار ہونا چاہتے تھے، مگر ٹکٹ کلکٹر نے پکڑ لیا اور ٹرین روانہ ہو گئی شاہ صاحب نے بہتیرا غُل مچایا مگر اُس نے نہ چھوڑا۔ ٹرین اسٹیشن سے گذر کر دفعتاً رُک گئی معلوم ہوا ہوا کہ انجن خراب ہو گیا ہے، آدھ گھنٹہ تک انجن خراب رہا۔ اتنے میں شاہ صاحب ٹکٹ کلکٹر کی آنکھ بچا کر ٹرین میں سوار ہو گئے اور انجن بھی ٹھیک ہو گیا!!

لوگوں نے اس واقعہ کو بھی شاہ صاحب کے روحانی اثرات سے

منسوب کر دیا، لیکن "عقل" کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو انجن کے پرزوں کو "روحانیات" سے کوئی تعلق بھی نہیں !! ——

بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو اس قسم کے اکثر واقعات نے ریلوے پر شاہ صاحب کا سکہ بٹھایا۔ پشاور سے کلکتہ اور بمبئی تک ہر طرف وہ بے ٹکٹ سفر کرتے تھے اور کبھی کوئی یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں !! ——

بعض اوقات شاہ صاحب عجیب عجیب باتیں کیا کرتے تھے، ایک دن مجھ سے کہنے لگے "تمہیں ایک سفید سانپ لاکر دوں گا، اُس کے سر میں ایک مُہرہ ہے، اس مُہرہ کی یہ تاثیر ہے کہ جو شخص اپنے بازو پر باندھ لے وہ انسانوں کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ خود سب کو دیکھتا ہے۔ دوسرے اس کو نہیں دیکھ سکتے نہ چھو سکتے ہیں —— بند دروازوں میں وہ اس طرح گذر سکتا ہے کہ گویا وہ کھلے ہیں ——

میں نے کہا شاہ صاحب کیا آپ نے کبھی طلسم ہوشربا کی کوئی جلد پڑھی ہے؟ —— میرے سوال پر توجہ نہ کر کے شاہ صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "وہ سفید سانپ ایک پہاڑ پر رہتا ہے، میرا بڑا دوست ہے، کہتا ہے جب میں مر جاؤں

تو یہ مہرہ میرے سر میں سے نکال لینا ——— اور جو میں ہی پہلے مر گیا ——— میں نے پھر کہا "شاہ صاحب طلسم ہوشربا کے مصنّف کے پاس تو اس سے بھی بہتر طلسمی چیزیں موجود تھیں، اُن میں سے ایک ہی مجھے دلوا دیجئے!" کہنے لگے "یقین نہیں آتا؟ ——— یقین نہیں آتا تو خاک ڈالو ———"

گرمیوں کا زمانہ تھا، میں طویل رخصت لے کر وطن آیا تھا وہاں سے اپنے اہل و عیال کو لے کر پہاڑ پر چلا گیا، آخر ستمبر کا موسم پہاڑ پر نہایت خوشگوار تھا۔ میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ میرے کمرے لب سڑک تھے ——— ایک دن میں دوپہر کو کھانا کھا کر قیلولہ کر رہا تھا کہ نیچے سڑک پر کچھ شور و غل ہوا اور اس شور و غل میں شاہ صاحب اور چند لونڈے اور کچھ راہرو چلے جا رہے ہیں اور شاہ صاحب حسب معمول شور مچاتے اور دوسرے لوگ ہنستے اور فقرے بازیاں کرتے ساتھ ساتھ ہیں میں نے جو یہ دیکھا تو اپنے ملازم سے کہا کہ دوڑ اور شاہ صاحب کو بلا کر لا ——— غرض شاہ صاحب آ گئے ——— بڑبڑاتے، خفا

ہوتے، شکوہ کرتے ——— "ارے میاں! مار ڈالا تم نے ہم کو۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر گئے ——— اور پھر کم بخت لونڈوں نے ہم کو دق کیا ——— پولیس پکڑے لئے جاتی تھی، وہ تو میں خدا خدا کر کے چھوٹا ——— لاؤ دو روپیہ تو دو!" ——— غرض وہ کئی دن تک بہار پر رہے، کھانا کھانے اور کبھی رات کو سونے کے لئے میرے پاس آجاتے تھے، پھر خدا جانے کہاں کہاں دن بھرتے تھے ——— ایک دن شام کو کہیں سے تھکے تھکائے آئے۔ آکر لیٹ گئے۔ میں نے ایک کمبل اُڑھا دیا ——— سردی اُس دن زیادہ تھی ——— کہنے لگے "آج میری دو باتیں سُن لو! تم کبھی جھوٹ نہ بولنا، رشوت نہ لینا اور انصاف کرنا ——— اور ایک بات یہ کہ بہت سے دوست پیدا نہ کرنا ——— تنہائی اچھی ——— تم سے ہو سکے تو میرے لڑکے کو اپنے پاس بُلا لینا، اُس کی تنخواہ کم ہے اور وہ تکلیف میں رہتا ہے ——— " میں نے کہا "شاہ صاحب تو آپ گویا وصیت کر رہے ——— ارادہ کیا ہے؟"

کہنے لگے "نہیں بھائی، کسی کو اپنا وقت تو معلوم نہیں ہوتا، معلوم نہیں کب بلاوا آجائے، میں کل یہاں سے جا بھی رہا ہوں۔ تم اپنی ملازمت پر چلے جاؤ گے، میرا آنا ہوا، نہ ہوا، دو چار باتیں خیال میں آئیں وہ کہہ دیں ——— کل دوپہر کو ہم تمہارے ساتھ کھانا کھائیں گے اور بھائی ہمارے ساتھ آٹھ دس مہمان اور بھی ہوں گے۔ کھانے کا کافی انتظام کر لینا ——"

باتیں کرتے کرتے وہ سو گئے، میں نے ایک کمبل اور ان کے اوپر ڈال دیا ——— ہوٹل والے سے معلوم ہوا کہ وہ صبح تین بجے بارش اور سخت سردی کی حالت میں دروازہ کھول کر نکل گئے خدا جانے کدھر گئے ——— میں تو مایوس ہی ہو گیا تھا، اس لئے کہ وہ اکثر اسی طرح بھاگ جایا کرتے تھے اور پھر مہینوں ان کا پتہ نہ چلتا تھا مگر اسی دن دوپہر کو وہ آ گئے لیکن اس وضع قطع کے ساتھ کہ کپڑے پھٹے ہوئے ایک نہایت پرانی انگریزی ٹوپی گھٹے ہوئے سر پر ——— ہاتھ میں ایک درخت کی کٹی ہوئی شاخ مع پتوں کے اور دامن میں قسم قسم کے پتھروں کے ٹکڑے ——— سرخ، سفید، پیلے، نیلے وغیرہ ——— ان کے پیچھے پیچھے دس بارہ سڑک کے لونڈے،

پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے وہ بے چارے ــــــ یہ لونڈے ـــــ ہوٹل کے اندر آتے ہوئے ڈرے مگر شاہ صاحب سب کو اندر پکڑ لائے "بھائی! آج ان کی دعوت کی ہے ہم نے" انہوں نے فرمایا ــــــ غرض کھانا آیا، لونڈوں نے خوب ڈٹ ڈٹ کے کھایا۔ کھانے کے بعد شاہ صاحب نے کہا کہ ان سب کو ایک ایک آنہ پیسہ بھی دو! وہ بھی پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شاہ صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے، کہنے لگے "ہم جا رہے ہیں" میں نے کب آئیے گا ــــــ کہا "دیکھو ــــــ شام کو نہیں تو صبح کو ــــــ یہ الفاظ جو شاہ صاحب کے آخری الفاظ تھے مجھے خوب یاد ہیں ــــــ شعر پڑھتے ہوئے، لونڈوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ رخصت ہو گئے ــــــ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہیں۔

دوسرے دن ان کا پتہ نہ چلا ــــــ مجھے کچھ تعجب بھی نہ ہوا، اس لئے کہ یہ تو اکثر ہوتا تھا کہ کہہ گئے ہیں شام کو آؤں گا اور صورت دکھائی دو مہینہ میں! لیکن اس دفعہ ان کے واپس نہ آنے سے میرے دل میں ایک قسم کی بے چینی تھی۔

——— دوسرا دن یوں ہی گزر گیا، تیسرے دن میں چہل قدمی کر کے واپس آیا ہی تھا کہ پولیس کے ایک سب انسپکٹر میرے پاس آئے۔ اُنہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کوئی پاگل آدمی میرے پاس آیا جایا کرتے تھے، جواب اثبات میں پا کر اُنہوں نے چند اور سوالات مجھ سے کئے اور اُس کے بعد مجھ سے کہا کہ "آپ ذرا تکلیف کیجئے میرے ساتھ آیئے"! میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا معاملہ ہے، بہر حال پولیس افسر کے ساتھ ایک رکشا میں بیٹھ کر میں روانہ ہوا ——— دو میل چلنے کے بعد پہاڑ کی آبادی ختم ہو گئی، چوڑی سڑک کے بجائے اب ایک تنگ اور پیچ در پیچ راستہ پر ہماری رکشا جا رہی تھی——— ہمالیہ کی سر سبز وادیوں میں، فطرت، انسانی عقل و سائنس کی تصنعات سے آزاد، اس طرح کہ اُس کے حُسن کی بہاریں کوہستان کے ہر ذرّہ سے لپٹی ہوئی تھیں، میری نظروں میں سمائی جاتی تھی——— نظروں میں نہیں ——— رُوح میں!! میں نے اس پہاڑ کے بہت سے مناظر دیکھے تھے، اس حصہ پر بھی بار بار آ چکا تھا۔ مگر وہ کیف تمام جو آج مجھ پر مسلّط تھا کبھی پہلے مجھے میسر نہ آیا تھا حسن فطرت کے ایک قلزم ناپیدا کنار میں گویا میں تیر رہا تھا———

——— مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ یکایک سب انسپکٹر کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے ——— "نیچے وادی میں دیکھئے، یہ قریب ہی، داہنی طرف کی چٹان پر ——— ایک لاش پڑی ہے ——— دیکھا آپ نے، وہ دیکھئے اس طرف جہاں چنار کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے ——— ہمارے آدمی رسیوں کے ذریعہ سے نیچے اُتر رہے ہیں ——"

میں نے دیکھا! شاہ صاحب کا جسم ایک شفّاف چٹان پر، چنار کے درختوں کے سایہ میں اس طرح پڑا تھا کہ اُن کا ایک داہنا ہاتھ سینہ پر رکھا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ سر کے نیچے ——— گویا سو رہے ہیں !!

تھوڑی دیر میں لاش اوپر لائی گئی، کوئی زخم، کوئی چوٹ، کوئی خراش جسم پر نہ تھی، چہرہ پر کسی تکلیف کے آثار بھی نہ تھے ——— ایک سکون کامل تھا ——— ابدی اور ازلی!! البتّہ ——— ان کے داہنے ہاتھ پر کہنی سے شانہ تک ایک سفید رنگ کا سانپ لپٹا ہوا تھا ——— وہ بھی مُردہ! سانپ کے سر میں ایک شگاف تھا، ایک ایسا خلا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز نکال لی گئی ہے وہ ایک خشک سوراخ تھا، زخم نہ تھا! ———

اس طرح ہم شاہ صاحب کو واپس لے کر آئے، لاش تھانہ میں لائی گئی۔ پھر ڈاکٹر کے معائنہ کے لئے لے جائی گئی۔ شبہ تھا کہ شاید موت سانپ کے کاٹنے سے واقعہ ہوئی ہو۔ لیکن جسم پر نہ کوئی زخم تھا نہ خون میں زہر کا کوئی اثر تھا ——————

میری درخواست پر وہ لاوارث لاش میرے سپرد کی گئی۔ بعض مسلمانوں نے اعتراض بھی کیا مگر میں نے لاش کو نہ غسل دیا نہ کفن، بلکہ سانپ کے جسم کو بھی اسی طرح اُن کے ہاتھ سے لپٹا رہنے دیا ——————

مغرب سے آدھ گھنٹہ پہلے، پہاڑ کی ایک سرسبز وادی میں جہاں قدرت نے پھولوں کی میلوں لمبی چادریں بچھا رکھی تھیں، شاہ صاحب کا جسد خاکی، سپرد خاک کر دیا گیا ——————

جب ہم میّت کو قبر میں اُتار رہے تھے تو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور چنار کے پتّوں سے نکل کر ایک عجیب راگنی اس ساری وادی میں پھیل رہی تھی —————— اس طرح یہ مسافر اپنے وطن کو واپس گیا!!

مجھے اُن کے گذر جانے کے بعد دیر نہ کہوں گا کہ مرنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ میرے دل میں کس قدر اُن کی محبت جاگزین تھی

مجھے خود اس سے پہلے اپنے اس حال کی خبر نہ تھی!!

——— لوگوں نے بہت پوچھا مگر میں نے سانپ کو اُن کے ساتھ دفن کرنے کی وجہ کو ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

——— میرے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ مجھے پہلے ہی بتا چکے تھے کہ ایک سفید سانپ اُن کا دوست ہے ———

——— رہا یہ امر کہ اس دوستی کا بھید کیا تھا۔

——— سو وہ مجھے معلوم نہیں اور میری عقل سے بھی بالاتر ہے ——— یہ داستان سچی ہے، اراکین مجلس اگر اس کو پسند کریں تو میرے لئے اُن کے "کلب" میں شرکت باعثِ مسرت ہوگی

———

رویائے صادقہ

"نقاشؔ صاحب کی ریفیس داخلہ
منظور کی گئی۔

ذات کے وہ نوربافت تھے، محلہ والے سب اُن کو
میر صاحب کہتے تھے، معمولی شُد بُد کے سوا پڑھے لکھے کچھ
زیادہ نہ تھے، اُن کے گھر کی عورتیں اور بچے سب آبائی پیشہ کرتے
تھے وہ خود بھی فرصت کے اوقات میں لب سڑک سُوت کا تانا
بانا درست کرتے ہوئے اکثر دیکھے جاتے تھے۔ مگر عموماً وہ
چھوٹے بچوں کو الف بے پڑھانا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ
اپنے مکان کے دروازے کے آگے ایک چھوٹی سی کھپریل
کے نیچے وہ بیٹھے ہوئے محلہ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو
تشریح الحروف کا سبق دیا کرتے تھے۔ وضع قطع مولویانہ تھی
سر پر ہمیشہ ایک چھوٹی سی گپڑی باندھے رہتے تھے، پاجامہ کے
بجائے اکثر نیلے رنگ کی لنگی، کرتہ گاڑھے کا وہ بھی اکثر میلا ——

یہ اُن کی وضع قطع تھی۔ حقّہ بہت پیتے تھے اور عموماً مکتب کے بچّے میر صاحب کی چلمیں بھرا کرتے تھے ——— یہ چلمیں بھرنا ان کی تعلیم وتربیت کا گویا ایک ضروری جزو تھا ———

معلوم نہیں کیوں لوگ ان کو بجائے ملّا جی کے میر صاحب کہا کرتے تھے۔ خدا بخش اُن کا نام تھا مگر بہت کم لوگ یہ نام جانتے تھے حتیٰ کہ ان کے گھر کے لوگوں میں بھی شاید ہی ایک دو کو اُن کا اصلی نام معلوم ہو ———

میر صاحب کی ایک عجیب عادت تھی، کبھی کبھی وہ بالکل خاموش ہو جاتے تھے ——— اس قدر کہ دو دو دن ایک حرف اُن کی زبان سے ادا نہ ہوتا تھا، ایسی حالت میں وہ عموماً مسجد میں جا بیٹھتے تھے یا چادر اوڑھ کر لیٹ رہتے تھے اور تانا بانا اور مکتب، حتیٰ کہ حقّہ بھی متروک و موقوف ہو جاتا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے چند پہاڑیاں تھیں، کبھی کبھی ان پر جا بیٹھتے تھے۔

محلّہ کے شرفا کی صحبت میں وہ اکثر بیٹھا کرتے تھے اور اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اکثر یاروں کا آلۂ تفریح بن جاتے تھے۔ اُن کے متعلق دل لگی کا مستقل مضمون تھا کہ وہ اکثر خوابیں دیکھا کرتے تھے

اور اُن کو بڑی سادگی کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ احباب ان کی خوابوں کا خوب مذاق اڑاتے تھے اور عجیب عجیب بے تکی تعبیریں تجویز کی جایا کرتی تھیں۔ مثلاً میر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ ایک شیر ایک ہرن پر حملہ کر رہا ہے ——————

یاروں نے فوراً تعبیر پیش کی کہ شیر درحقیقت شیطان ہے اور ہرن میر صاحب ہیں! یا میر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ درخت سے ایک پکا ہوا آم گرا ہے، یاروں نے فوراً تعبیر دی کہ میر صاحب کے گھر میں یقیناً بچہ ہونے والا ہے! ——————

غرض تعبیروں کا یہ سلسلہ اکثر بہت پُر لطف رہا کرتا تھا، مگر میر صاحب بے چارے کبھی یہ محسوس نہ کر سکے کہ ان سے مذاق کیا جا رہا ہے! —————— یہ کوئی چالیس برس کی بات

ہے، میری نوجوانی کا زمانہ تھا، ان صحبتوں میں جہاں میر صاحب سامانِ تفریح بنائے جاتے تھے، میں بھی اکثر موجود ہوتا تھا۔ اب میر صاحب کو انتقال کئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے لیکن اُس تمام تفریح اور مذاق میں —————— اب جو غور کرتا ہوں تو بہت سے

عجیب پہلو نظر آتے ہیں۔ یا تو پہلے اپنی جوانی کی ترنگ میں کبھی ان باتوں کی طرف خیال نہ گیا، یا اب بڑھاپے کے آغاز نے نومّات

پیدا کر دیئے ہیں ———— غرض کسی نہ کسی وجہ سے میر صاحب مرحوم کی بہت سی باتیں بالکل نئے رنگ میں نظر آ رہی ہیں ————

مجھے اپنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ خدا کے فضل سے معاش کی فکر نہ تھی اس لئے اکثر لمبے لمبے سفر کرتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں بمبئی جانے کے لئے سامان سفر تیار کر رہا تھا کہ میر صاحب آ گئے۔ پہلے اس سے کہ میں سفر کا ارادہ ظاہر کر دوں، انہوں نے بیٹھتے ہی حقّہ اپنی طرف بڑھایا اور کہنے لگے:

"میاں! رات ہم نے ایک خواب دیکھا!"

"ہاں! میر صاحب! کیا دیکھا آپ نے؟"

"ہم نے دیکھا کہ ایک جنگل میں صبح کا وقت ہے، بارش ہے اور ایک دریا ہے ———— بہت بڑا ————"

"دریا ہے؟ بہت بڑا؟ تو پھر کیا ہوا میر صاحب؟"

"بس میاں! میں نے دیکھا کہ اس دریا میں تم ایک کشتی پر سوار چلے جا رہے ہو اور کشتی جھکولے کھا رہی ہے، یہ معلوم ہوتا

ہے کہ اب ڈوبی، اب ڈوبی! میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا ——"

"گھبرا گئے آپ میر صاحب؟ واہ میر صاحب؟ جو کشتی جھکولے نہ کھائے وہ کشتی ہی کیا؟"

"میاں! مَیں تو گھبرا گیا، جلدی سے میں نے اپنی چادر دریا کے کنارے پر بچھادی اور سجدہ میں گر کر تمہارے لئے دعا کرنے لگا۔ ——"

"دعا تو مقبول ہوئی، میر صاحب! دیکھئے میں بخیریت گھر آ گیا! ——"

اُسی دن شام کو میں روانہ ہو گیا —— جاڑوں کا زمانہ تھا اور رات کو بارش ہونے لگی بمبئی ایکسپرس پوری رفتار سے جا رہا تھا۔ میں کمبلوں میں لپٹا ہوا کچھ سو رہا تھا کچھ جاگ رہا تھا مگر جاگ کم رہا تھا، سو زیادہ رہا تھا۔ یکایک ایک سخت جھٹکا لگا اور گاڑی رُک گئی —— میں بستر سے گرتے گرتے بچا۔ گھبرا کر کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ بارش ہو رہی ہے اور انجن کے پاس کچھ لوگ لالٹینیں لئے کھڑے ہیں —— جب گاڑی کو ٹھہرے ہوئے بہت دیر ہو گئی تو میں گاڑی سے اُترا، اور بھی بہت سے مسافر دریافت حال کے لئے اُتر چکے

تھے ——— معلوم یہ ہوا کہ دفعتاً انجن خراب ہو گیا۔ ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک بڑے دریا کا پل تھا۔ انجن کا ایک ملازم پل کے چوکیدار کو بلانے کے لئے اس طرف گیا تو اس نے دیکھا کہ چوکیدار غائب ہے دریا چڑھا ہوا ہے اور پل ٹوٹا پڑا ہے۔ زندگی کے فرشتے نے عین وقت پر انجن کی مشین خراب کر دی ورنہ ایک ہی فرلانگ کے فاصلے پر موت کا فرشتہ منہ کھولے بیٹھا تھا!

——— جوانی میں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوا کرتی کہ موت اور زندگی کے درمیان فاصلہ کس قدر کم ہے! جوان آدمی سمجھتا ہے کہ وہ زندہ اس لئے ہے کہ زندہ رہنا اس کا حق ہے۔ موت سے اس کو کچھ واسطہ نہیں!! اس قسم کے واقعات کا جو اثر بڑھاپے میں طبیعت پر ہوتا ہے جوانی میں نہیں ہوتا۔ اس وقت تو صرف ایک "اونہہ" کہہ کر بڑی سے بڑی بات ٹال دی جاتی ہیں! ——— قصہ مختصر ہماری ٹرین ایک بڑے سٹیشن واپس لائی گئی۔ صبح کو دریا کے دوسرے کنارے پر ادھر سے ایک ٹرین لائی گئی اور ادھر سے مسافر کشتیوں پر سوار کر کے اس پار پہنچائے گئے ———

صبح کا وقت تھا، ——— ہوا بہت تیز تھی ——— ہماری کشتی ہچکولے لے رہی تھی۔ ——— بہت سے مسافر تو اس قدر خوف زدہ تھے کہ کشتیوں پر سوار ہو کر پھر اتر گئے۔ میری کشتی پر صرف ایک انگریز اور اس کی بیوی میرے ہم سفر تھے ———

یہ بھی ایک لطیفہ ہے بیان کر دینے کے قابل ——— پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا اور آندھی کی وجہ سے کشتی کی حالت یقیناً خطرناک تھی، میں بھی پریشان تھا اور فرنگی صاحب کی بیوی تو بیچاری اپنے بکس اور بستر پر خوف کے مارے اوندھی پڑی ہوئی تھی، مگر میرا ہم سفر وہ انگریز بہت مطمئن تھا اور اُس ہوا میں بار بار اپنا سگریٹ سُلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بے پرواہی کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ میں نے مُسکرا کر اُس سے کہا "آپ بہت مطمئن ہیں!" وہ کہنے لگا۔ "غیر مطمئن ہونے سے کیا فائدہ ہے! اگر ڈوبنا ہی ہے تو میں ایک سگریٹ اور کیوں نہ پی لوں!" ———

بے ثباتِ زندگی کے متعلق یہی نقطہ نظر ہے جو زندگی کی ضمانت ہے ——— زندگی کے پھل کو اتنا نچوڑو کہ اُس کے رَس کا آخری قطرہ بھی باقی نہ رہ جائے۔ ———

مرتے دم تک زندگی کے مزے اٹھائے جاؤ، روتے ہوئے گئے تو کیا گئے! موت کے اندیشہ میں گھُلتے رہنے سے موت ٹل تو نہیں جاتی! پھر اندیشہ کیوں !! ——— اس انگریز کے اطمینانِ قلب کو میں کبھی نہ بھُول سکا ———

ہم بخیر و عافیت دوسرے کنارے پر پہنچ کر پھر ٹرین میں سوار ہو

گئے ———————

———————

اسی طرح ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد آتا ہے

——— والد مرحوم ہردوئی کے ضلع میں ایک بزرگ کے مزار پر اکثر جایا کرتے تھے، خصوصاً عرس کے زمانہ میں۔ غالباً میرے اندر ایمان اور عقیدہ پیدا کرنے کے لئے اکثر مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ قوالی اور میلہ کی چہل پہل کے سوا اور کوئی ترغیب میرے لئے ایسے موقعوں پر نہ ہوتی تھی! مقدس مزاروں کے "عرفانیات" سے اُس وقت بھی اتنا ہی بے بہرہ تھا جتنا کہ اب ہوں۔ بہرحال والد مرحوم کے ساتھ خوش و ناخوش جانا ہی پڑتا تھا۔ ———

میر صاحب ایک دن رات کو آئے، حقہ کے دو چار کش لے کر وہ ذرا کھانسے۔ کہنے لگے:۔

"میاں! رات ایک عجیب خواب دیکھا ہم نے"

"پھر آپ نے کوئی خواب دیکھ ہی ڈالا میر صاحب؟"

میں نے کہا۔

"ہاں! میاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی"

"سنائیے تو ذرا، ہم بھی اپنی عقل پر کچھ زور ڈالیں گے،"

شاید تعبیر ہاتھ آئے"!

کہنے لگے "بھئی، یہ خواب دیکھا ہم نے کہ ایک جنگل بیابان ہے، اس جنگل میں ایک پختہ کنواں ہے اور اُس کنویں کے پاس ہم کھڑے ہیں اور ہمارے ہاتھ میں دو بیلوں کی نکیل ہے —— گویا ہم ان کو پکڑے کھڑے ہیں ——

بس پھر آنکھ کھل گئی"!

میں نے کہا واہ میر صاحب! بہت بے موقعہ آنکھ کھلی آپکی! اگر بیل نے آپ کے پیٹ میں سینگ مار دیا ہوتا اور اُس صدمہ سے آپ کی آنکھ کھل جاتی تو کوئی بات بھی ہوتی —— یہ کیا کہ بلا وجہ آپ کی آنکھ کھل گئی —— معلوم نہیں آپ کو بیل کہاں لے جاتے ——

یا آپ بیلوں کو کسی طرف لے جاتے، پھر اُس کے بعد خبر نہیں کونسا عجیب واقعہ پیش آتا —— یہ تو کچھ نہ ہوا کہ آپ کی آنکھ قبل از وقت کھل گئی"!

"ہاں میاں!" وہ کہنے لگے "بس ہم نے تو اتنا ہی خواب دیکھا"۔

"تو پھر آپ تعبیر چاہتے ہیں اس خواب کی؟" میں نے سوال

کیا ـــــــ "تعبیر یہ ہے کہ یا تو وہ دو بیل فرشتے تھے جو اس کنوئیں کے اندر آپ کو لے جانا چاہتے تھے ـــ ممکن ہے جنّت کا راستہ اُسی کنوئیں کے اندر رہو، یا ممکن ہے وہاں کوئی خزانہ رکھا ہو ـــــــ اور اگر وہ فرشتے نہ تھے، ـــــــ منکر و نکیر بھی نہ تھے تو یقیناً آپ کے کسی دشمن کی ارواح تھیں۔ خیریت ہوئی کہ انہوں نے سینگ نہیں مارا ـــــــ اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا میر صاحب!" ـــــــ

میر صاحب بے چارے "شئے لطیف" سے اس قدر محروم تھے کہ گفتگو کے اس اتار چڑھاؤ کو کبھی نہ سمجھ سکے ـــــــ

"نہیں میاں! یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی" انہوں نے کہا ـــــــ

"تو پھر آپ ذرا اپنا فالنامہ بھی دیکھئے" ـــــــ

میر صاحب کے پاس مطبع نول کشور کا چھپا ہوا ایک بوسیدہ فالنامہ بھی تھا جس سے وہ اکثر اپنی خواب کے الجھٹوں کو سُلجھانے میں مدد لیا کرتے تھے۔ ـــــــ

غرضکہ اُس دن کی یہ بات آئی گئی ہوئی۔ تین چار دن بعد میں والد کے ساتھ عرس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوا ـــ

—— روانہ کیا خاک ہوا، "ڈولے بہ نذش" کے ذیل میں جانا پڑا —— ریل کے اسٹیشن سے ۱۵ میل کے فاصلہ پر ہماری منزل تھی، عموماً اسٹیشن پر گھوڑے کا ایک تانگہ مل جایا کرتا تھا، لیکن اس دفعہ نہ معلوم کیوں کوئی سواری موجود نہ تھی۔ مجبوراً قریب کے گاؤں سے ایک رتھ کرایہ پر لیا گیا۔ دوپہر کو ہم روانہ ہوئے اور امید تھی کہ شام ہوتے ہوتے منزل پر پہنچ جائیں گے۔ کوئی چار بجے ہوں گے، ہم آدھے راستہ میں تھے اور ایک کنویں پر پانی پینے کے لئے ٹھہر گئے تھے کہ یکایک ایک شدید آندھی آئی، —— ایسی شدید کہ میں نے اس سے زیادہ شدید آندھی اپنی عمر میں نہیں دیکھی تمام جہاں تیرہ و تار ہو گیا، ہاتھ سوجھائی نہ دے اور ہوا کی شدّت کا یہ حال کہ ہم دونوں رتھ میں نہ بیٹھ سکے، نیچے اُتر کر رتھ کے پہئے پکڑ کر بیٹھ گئے لیکن ہوا اُس بھاری رتھ کو زمین سے دو دو ہاتھ اٹھا رہی تھی، ایک جھونکا تو ایسا آیا کہ رتھ اور اُس کے ساتھ ہم اور رتھ بان سب ہی لوٹتے پوٹتے کہاں سے کہاں پہنچے —— یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس آج اس جنگل میں خاتمہ ہے! —— خدا خدا کر کے تاریکی کم ہوئی اور ہوا کی شدّت بھی ——

اب جو دیکھا تو والد ایک درخت کی جڑ میں پڑے ہیں ہیں دوسرے درخت کی، اور رتھ بان رتھ کے نیچے دبا پڑا ہے۔ اور رتھ کنویں سے آدھے فرلانگ کے فاصلہ پر اوندھا پڑا ہے!! ہم تینوں آدمی زخمی ہوئے تھے اور اب کوئی امید نہ تھی کہ منزل پر پہنچ سکیں۔ خیال یہ تھا کہ اس طوفان میں جب رتھ آدھے فرلانگ تک اُڑ گیا تو اُس کے بیل تو خدا جانے جنگل میں کہاں کے کہاں پہنچے ہوں گے —— مگر کنویں کی طرف جو آئے تو دیکھا کہ دونوں بیل بدستور اُسی جگہ کھڑے ہیں جہاں رتھ میں جُتے ہوئے کھڑے تھے!! حیرت ہوئی کہ آندھی کے اُس ہنگامہ میں کس طرح وہ اپنی جگہ کھڑے رہے —— بہر حال زخمی اور خستہ، اُسی رتھ میں رات کو منزل پر پہنچ گئے ——

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت!! —— وہ کنواں عرصہ تک مجھے یاد رہا۔ عرصہ تک میں کبھی کبھی میر صاحب سے کہا کرتا تھا کہ میر صاحب اگر یہ وہی کنواں ہے جو آپ نے خواب میں دیکھا تھا تو ضرور اُس میں یا تو جنات رہتے ہیں، یا جنّت کی طرف جانے کا کوئی دروازہ ہے یا کوئی خزانہ موجود ہے!! —— میر صاحب حقہ کے کش لے لے

کر اپنا کوئی دوسرا خواب سُنانا شروع کر دیتے —

میر صاحب کو خود بھی یہ خیال تھا کہ اُن کا خواب اکثر سچّا ہوتا ہے اور اس کے ثبوت میں وہ بہت سے واقعات پیش کیا کرتے تھے مثلاً وہ کہتے تھے کہ جب میں چاند گرہن یا ستارہ ٹوٹتے ہوئے خواب میں دیکھتا ہوں، تو کوئی بڑا مشہور آدمی ضرور مرتا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ اُنہوں نے ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو شاہ ایڈورڈ کے انتقال کی خبر آئی۔ پھر ایک دفعہ یہی منظر انہوں نے خواب میں دیکھا تو امیر حبیب اللہ خاں قتل ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ اگست ۱۴ء کے پہلے ہفتہ میں انہوں نے دیکھا تھا کہ ایک بہت بڑا دریا ہے اور اُس کے دوسرے کنارے پر جنگل میں تا حدِّ نظر آگ لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ اُنکی رائے میں یہ اشارہ تھا اُس جنگِ عظیم کی طرف جو یورپ میں دو چار ہی دن بعد شروع ہو گئی ———— غرضکہ میر صاحب کے پاس اس قسم کے واقعات کی ایک طویل فہرست تھی۔ ہم تو قطع کلام کر کے کبھی ان کو پوری فہرست سُنانے کا موقع نہیں دیا کرتے تھے، مگر تاہم اُن کو اپنے خوابوں کی ایسی تعبیروں پر بہت

وثوق تھا ــــــــ غرضکہ ہماری دل لگی کا یہ سلسلہ ہمیشہ تازہ بتازہ جاری رہتا تھا۔ اُسی زمانہ میں رُوس سے لینن کے مرنے کی خبر آئی۔ ہم نے میر صاحب سے کہا "واہ میر صاحب، مار گئے۔ اس دفعہ تو آپ کو پتہ ہی نہ چلا اور لینن مر گیا۔ دے گیا آپ کو غچّا ــــــــ بھلا اتنا بڑا آدمی مرے اور آپ کو خبر بھی نہ ہو۔ آپ کے مؤکّل بہت غافل رہنے لگے ہیں ــــــــ"

میر صاحب فرماتے "نہیں تو میاں، خواب ہمیشہ تو نظر آتے ہی نہیں، کبھی کبھی نظر آتے ہیں، ہم کہتے "نہیں میر صاحب! یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ دُور کے خواب آپ کو نظر ہی نہیں آتے، افغانستان اور انگلستان تک کی خبر تو آپ لاتے ہیں، مگر رُوس کا ملک بہت دُور ہے ــــــــ گولی کی زد سے باہر! بس اب رہنے دیجئے، معلوم ہوئی آپ کی نارسائی!" ــــــــ

ایک دن صبح ہی صبح میر صاحب آئے ــــ کچھ گھبرائے ہوئے سے ــــــــ فالنامہ اُن کے ہاتھ میں ــــــــ آتے ہی کہنے لگے "میاں! رات

ایک خواب دیکھا کہ میں ایک دریا کے کنارے بیٹھا ہوں، چودھویں رات کی چاندنی کھِلی ہوئی ہے، ——— میں اس قدر خوش ہوں کہ بار بار میرا جی چاہتا ہے کہ اس دریا کے شفّاف پانی میں کود پڑوں ——— یکایک ہوا چلنی شروع ہوئی اور ایسا غلیظ ابر آیا کہ ہر طرف سخت تاریکی پیدا ہو گئی، چاند کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا اور دریا کا چمکتا ہوا پانی بھی نظر نہ آتا تھا، مگر پانی سے ایک عجیب قسم کی خوفناک آواز پیدا ہونے لگی۔ پھر یکایک بادل گرجا اور بجلی کڑک کر پانی پر گری اور اسی کے اندر غائب ہو گئی ———

——— "میر صاحب نے اپنے کرتہ کے دامن سے پیشانی کا پسینہ پونچھا ——— "میرے دل پر خوف طاری ہے، اللہ رحم کرے میاں! میں نے کہا۔ "واہ میر صاحب! آپ تو گھبرا گئے، رات آپ نے کھایا کیا تھا؟ وہ بیچارے میرے اشارہ کو کچھ نہ سمجھے فوراً کہنے لگے "ارد کی دال، روٹی، اور دہی ——— میں نے کہا کہ بس تو میر صاحب معلوم ہو گیا، رات آپ کے معدہ میں رطوبات بہت زیادہ پیدا ہوئیں، مرطوب گیس نے دماغ کو گھیر لیا ——— اور ایسا تو اکثر ہوتا ہے آپ پوچھ لیجئے کسی طبیب سے ———

——— میر صاحب بے چارے کے دل کو تسکین نہ ہوئی!
قضا نے قصہ مختصر کر دیا! دوسرے دن اُن کا ایک بچہ طاعون میں مبتلا ہوا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر بیوی، پھر ایک اور عورت، غرض تین دن میں سارا گھر صاف ہو گیا! میر صاحب اکیلے رہ گئے ———

——— ہم لوگ اس حالت میں جو کچھ ہمدردی اور دلداری کر سکتے وہ کی لیکن میر صاحب کا زخم بہت گہرا تھا!! اس دن سے وہ بالکل خاموش ہو گئے، نہ بات کرتے تھے نہ کسی کی بات کا جواب دیتے تھے!! صبح کو گھر سے نکل جاتے تھے اور پہاڑیوں پر پھرا کرتے تھے، شام کو عشا کے وقت مسجد میں آکر لیٹ جاتے تھے!! آخری جنازہ اٹھانے کے بعد وہ پھر کبھی اپنے گھر کے اندر نہیں گئے ——— اُن پہاڑیوں میں شہر کے محکمہ آب رسانی کا ایک ذخیرہ آب تھا، اکثر وہ اُس کے قریب بیٹھے ہوئے پائے گئے ——— ایک دن اُس کے حوض میں اُن کی لاش تیرتی ہوئی ملی
خاندان کے اوراق بھی اُن کی لاش کے قریب ہی تیر رہے تھے!!

——— رویائے صادقہ از سید ہاشم [illegible] ماخوذ

میں حدِّ فاصل کیا ہے ——— کچھ ہے بھی؟
مجھے خبر نہیں۔ انجمن کے دوسرے ارکین اس تاریکی میں روشنی کی کوئی
شعاع پائیں تو مجھے ضرور بتائیں ———!!

چاہ نخشب

(راز جہاں گرد)

اطلاع ملی ہے کہ چند روز ہوئے راقم الحروف پاگل خانہ میں داخل کر دیئے گئے اس لئے اب اس بیان پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ داخل دفتر کیا جائے *

عجیب ہے میری داستان

میری داستان کا یہ ایک ورق

کوئی یقین کرے یا نہ کرے، تو واہ واہ نہ کرے تو واہ واہ!
جو کچھ لکھنا تھا، لکھ دیا میں نے! اس کے بعد جو کچھ ہے وہ پڑھنے والوں کی عقل و فہم ہے اور اُس پر مجھے بھروسا نہیں!! ہاں صاحب! تو اب سنئے۔

۱۱ برس کی عمر سے میں نے سیاحی شروع کی، پاؤں میں کچھ ایسا چکر ہے کہ کبھی کسی ایک جگہ برس چھ مہینہ جم کر نہیں رہتا، دنیا کے کونہ کونہ اور گوشہ گوشہ کی خاک چھان ڈالی۔ آج عراق میں تو کل ایران میں، پرسوں رُوس میں تو اگلے دن نہر سویز پر! نہر سویز سے قلانچ ماری تو پناما پر! پناما سے چلا تو ٹوکیو میں! — غرض کہ اگر میری ٹانگیں کسی گھسنے والی مادہ کی بنی ہوتیں تو آجتک

آدھے سے زیادہ گھس چکا ہوتا!! بارہا ارادے کئے کہ بس اب جہاں گردی ختم کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ رہوں لیکن طبیعت کمبخت ناصبور ہے ———— جہاں چند روز دم لیا اور سیّاحوں کے آوارہ گرد شیطان نے انگلی دکھائی ———— بھاگا ———— منہ اُٹھائے۔ آنکھیں بند کئے! ————

ایک دفعہ شیراز میں "آبِ رکنا باد" کے ساحل پر چار مہینے بیٹھا رہا، طے کر لیا کہ یہیں مریں گے ————

پھر جو ایک دن ہڑک اُٹھی تو سمرقند میں آ کر دم لیا!! ————

جس سفر کا حال بیان کرتا ہوں، یہ گویا میرا آخری سفر سمجھیے، ———— میری عادت ہے کہ اپنے ہر سفر کا ایک روزنامچہ ضرور لکھتا رہتا ہوں، کہیں کہیں سے اُس کے دو چار اقتباسات اراکینِ انجمن کے لئے شاید دلچسپی کا باعث ہوں ———— اور اگر نہ ہوں تو یہ بدنصیبی اراکینِ انجمن کی! ————

مئی کا مہینہ تھا جب میں کابل سے ہرات آیا، ہرات سے مرو جانے کا قصد تھا اور پھر مرو سے بخارا، سمرقند، تاشقند ہوتے ہوتے

ماسکو، یوں تو کئی دفعہ وسط ایشیا کے پھیرے کر چکا تھا، مگر کبھی وہاں زیادہ ٹھہرنے اور وہاں کے کوہ وصحرا میں خاک اڑانے کا کافی موقع نہ ملا تھا۔ اب کی دفعہ ارادہ تھا کہ چند روز چنگیز، تیمور اور بابر کے وطن میں بے فکری اور اطمینان کے ساتھ گزاروں۔

—— مگر کیا معلوم تھا —————— معلوم تو تھا مگر بھول گیا تھا —————— کہ ارادے خود بخود بدل جایا کرتے ہیں، منہ مشرق کی طرف ہوتا ہے اور انسان چلتا ہے مغرب کی طرف!!! اس کارخانہ میں جس کو دنیا کہتے ہیں۔ ہم، مع اپنے ارادوں کے فرعون کے غلاموں سے بھی بدتر ہیں —————— رسیاں ہمارے گلوں میں ہیں اور کوئی ہے ہمارے پیچھے —————— چابک بدست! جس کے تازیانہ کی ضربیں سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی کب دیتی ہیں!! —————— یہ غلام کیا جانیں کہ کدھر سے آئے اور کدھر جانا ہے!! —— خیر —————

تو مئی کا مہینہ تھا جب میں ہرات سے مرو کی جانب روانہ ہوا۔ آگے کا حال میرا روزنامچہ بتائے گا۔

۲۱ رمئی۔

کرخ نامی قصبہ سامنے ہے ، پہاڑی سڑک پر سورج کی تمازت اور صحرائی ہوا کے گرم جھونکے ! میرے ہم سفر دو تاتاری اور ایک افغان ہیں : تاتاریوں میں سے ایک سفید ریش بڈھا یعقوب نامی ہے جو قصبہ میمنہ میں ایک تکیہ کا متولّی ہے۔ ——— باتونی اتنا کہ الٰہی توبہ ، کان کھا گیا ! ایسے ایسے قصّے سناتا ہے کہ گویا اس ملک میں انسانوں سے جنّات کی تعداد زیادہ ہے۔ ہر منزل پر وہ جنوں اور پریوں کا ایک نیا قصہ سنا دیتا ہے۔ ———

ہمارے ملک میں بھی کوہ قاف کی پریاں اور دیو بہت مشہور ہیں۔ میں نے بھی کوہ قاف کے پہاڑوں پر بہت ٹھوکریں کھائی ہیں مگر آج تک ایک کانی کُھتری پری بھی نظر نہ آئی !! لیکن ہمارے ہم سفر یعقوب کو ہر روز ان ارواح سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور وہ ان پریوں اور دیوؤں کے ساتھ اپنی دوستی اور دشمنی کے عجیب عجیب قصّے سُناتے ہیں ! ———

میرا گھوڑا جنگل کے کانٹوں میں اُلجھ اُلجھ کر بگڑتا ہے ، مگر تاتاریوں کے اونٹ بے تکان چلے جا رہے ہیں میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ اونٹ اُن کانٹوں کو کیونکر بے تکلّف کھا جاتے ہیں جن کی

نوکیں سوئیوں کی طرح زخمی کرتی ہیں۔ ہم ان کانٹوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے اور اونٹ کے منہ میں وہ بالائی کی طرح گھل جاتے ہیں راستے میں کہیں کہیں ترکمانوں کے خیمے اور ڈیرے بھی ملتے ہیں میں اُن کی زبان خوب بول لیتا ہوں اس لئے بے تکلّف دس پانچ منٹ کسی خیمہ کے آگے ٹھہر کر دم لیتا ہوں، دو گھونٹ پانی پیتا ہوں اور پھر چل دیتا ہوں۔ شام تک سوائے لق و دق میدان، کانٹے دار جھاڑیوں اور متفرّق اونچی نیچی پہاڑیوں کے کوئی منظر ایسا نہ تھا جو آنکھوں کے لئے تسکین دہ ہوتا ـــــــــــ خدا خدا کر کے انسانوں کی آبادی نظر آئی۔ ہم رات کو ۸ بجے کے قریب کر کی پہنچے۔

۲۲ مئی

دریائے جیحوں دو قلعوں کے درمیان بہتا ہے۔ دائیں کنارہ پر ایک چھوٹا سا پرانا قلعہ ہے اور بائیں کنارہ پر ایک بڑے قلعہ کے دامن میں یہ بستی ہے۔ آج کل دریا چڑھا ہوا ہے بستی کی سرائے میں اُس کے بہنے کی آواز اس طرح آ رہی ہے کہ گویا کوئی آلہ ہوائی ہوا میں اڑتا ہوا جاتا ہے ترکمانوں کو لَے اور قرأت کے ساتھ منظوم کہانیاں سننے کا بہت شوق ہے۔ رات کو سرائے کے صحن میں

دس بیس آدمی اگر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی کہانیاں گا گا کر ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ رات میں بھی کچھ دیر اُن کی صحبت میں شامل رہا۔ صحرائی لوگ ہیں، سادہ لوح، سادہ دل، غضب ناک، از ود رنج قوی اور بے خوف ——— ایسے جو تیمور اور بابر کی اولاد ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں! ——————— بدویت اُن کے رگ و ریشہ میں ہے۔ اُن کی کہانیاں سب کی سب جنات پریوں اور ارواح خبیثہ کے ذکر سے پُر ہوتی ہیں حضرت سلیمانؑ کے قصے، ہاروت ماروت کی داستان، کوہ قاف کی پریوں اور اُن کے بادشاہ کے حالات ——— بس یہی ان لوگوں کی کہانیاں ہیں ——— دنیا سے بے خبر اور بے پروا!! ——— کیا اب بھی کبھی وسط ایشیا کے کسی صحرا نشین کا مرکب البرز یا ہمالیہ کی چوٹیوں کو ٹھکرا سکے گا؟

——— خدا جانے!!

۲۳، مئی

صبح کرکی سے روانہ ہو کر سہ پہر کو قرشی پہنچ گئے۔ دن بھر کا سفر بہت غیر دلچسپ تھا، راستہ میں ایک قافلہ ہرات کی طرف جاتا ہوا ملا۔ زیادہ ترکمان تھے، اونٹوں پر اُون لدی ہوئی

بھی ——————— کس طرح اس دُنیا کے مسافر راستہ میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ ایک لمحہ کی ملاقات ——————— زندگی کے لق و دق صحرا میں۔ کس قدر خوش آیند ہوتی ہے، پھر اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے راستہ چلا جاتا ہے ——————— تھوڑی دیر بعد صحرا میں اُن کا نشان بھی باقی نہیں رہتا ——————— تھوڑی سی گرد اُڑتی ہوئی رہ جاتی ہے، ——————— چند ساعت کے بعد وہ گرد بھی باقی نہیں رہتی، وہی صحرا ہوتا ہے، وہی پہاڑ یا وہی سکون مطلق!!! ملنے کی خوشی اور جدائی کا رنج بھی باقی نہیں رہتا!! ———————

اس قدیم قصبہ کا نام کسی زمانہ میں نخشب تھا۔ فارسی اور تورانی ادبیات میں اس کا قدیم نام آج تک بھی مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک جادوگر رہتا تھا جس نے ایک چاند بنایا تھا جو ہر شب کو ایک کنوئیں سے نکلا کرتا تھا اور صبح کو پھر کنوئیں میں غروب ہو جاتا تھا۔ فارسی زبان میں "ماہ نخشب اندر چاہ نخشب" آج تک زبان زد ہے۔ میں بھی اس کنوئیں کو دیکھنے گیا تھا۔ بہت شکستہ اور بوسیدہ حالت میں ہے۔ خانہ بدوش ازبکوں کے خیمے اس کے

قریب ہی لگے ہوئے تھے، اُن کی بھیڑوں کے گلّے سامنے جھاڑیوں کے پاس چر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جادوگر کا چاند ایک دن اس کنویں میں ایسا غروب ہوا کہ پھر نہ نکلا۔ جادوگر بھی دیوانہ ہو کر اسی کنویں میں کود گیا ——— رات کو ازبکوں نے اِس کنویں کے متعلق عجیب عجیب قصّے سُنائے

۲۴ مئی

سمرقند قریب ہے، ایک دن کی مسافت سے زیادہ نہیں یا شاید کچھ زیادہ ہو اس لئے کہ موسم گرم ہے اور راستہ بہت ناہموار ہے۔ بہرحال اگر صبح روانہ ہو جاتا تو شام تک پہنچ ہی جاتا لیکن طبیعت بہت کسلمند ہے، سب ساتھی روانہ ہو گئے اور میں نخشب ہی میں پڑا رہ گیا۔ بیمار تو نہیں ہوں، چاہتا تو چل دیتا لیکن معلوم نہیں کیوں ارادہ کمزور ہے!! ——— دن بھر سرائے میں پڑا رہا شام کو سرائے کے قریب ایک مسجد ہے اس کے صحن میں جا بیٹھا۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر جادوگر والے کنویں کے چبوترہ پر بیٹھ کر روزنامچہ لکھنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ ازبکوں کے خیمے اکھڑ چکے۔ وہ اپنے گلّوں کو لے کر کسی طرف چل دیئے۔ ہر طرف سناٹا ہے ——— طبیعت تھکی ہوئی ہے، نیند سی

آرہی ہے ——— ذرا لیٹ رہوں ———
غنودگی پُر لطف ہے ——— غنودگی کیا اچھا خاصہ نشہ
معلوم ہوتا ہے ——— آنکھیں جھکی جاتی ہیں
——— کنویں کے اندر ایک قسم کی روشنی نظر آتی ہے
——— کہیں جادوگر کا چاند تو نہیں ہے!
——— "ماہِ نخشب اندر چاہِ نخشب" ———
ماہِ نخشب اندر ——— ماہِ نخشب ———
ماہ اندر چاہ ——— ماہِ نخشب ———
چاہ ——— ماہ ———

یکایک میری آنکھ کھُلی۔ گویا بہت بلندی سے نیچے گرا ہوں
——— گرتا چلا جاتا ہوں ———
ایک اندھیری سُرنگ ہے ——— اس قدر اندھیری
——— اس قدر اندھیری ———
اس قدر کہ بس! ماہ نخشب کی تلاش ہے مجھے ———
سامنے روشنی کا ایک نقطہ نظر آتا ہے، میرے گرنے کی رفتار
تیز ہوتی جاتی ہے، جس قدر وہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ روشنی کے اس

نقطہ کا حجم بڑھتا جاتا ہے ——— کہیں یا ہِ نخشب
تو نہیں؟ روشنی ٹھنڈی ہے اور تیز ———
ایک جھٹکا لگا، حرکت ختم ہو گئی، میرا جسم ٹھہر گیا، آنکھیں کھُل گئیں!
سامنے ایک دیوار تھی اس دیوار میں ایک دریچہ تھا ———
بند ——— اس سربستہ دریچہ میں ایک چھوٹا سا گول
سوراخ تھا، اُس سوراخ سے ایک تیز روشنی نکل رہی تھی۔
——— یکایک وہ سوراخ پھیلنے لگا۔ وہ روشنی
بھی پھیلنے لگی ——— کسی نے اُٹھا کر مجھے اُس
سوراخ کی طرف پھینکا ——— ایک دھماکا
ہوا، جیسے میں زمین پر گرا۔ روشنی اس قدر تیز تھی ———
مگر گرم نہ تھی ——— کہ آنکھیں بند ہو گئیں ———
"اُٹھ!" کسی نے "تاتاری زبان میں کہا ———
"میں کہاں ہوں؟ یہ کیا جگہ ہے؟" میں نے سوال کیا
"چاہِ نخشب ہے یہ، "اُٹھ!" پھر آواز آئی۔
کوئی مجسم جاندار سامنے نہ تھا مگر آواز اس طرح آ رہی تھی
کہ گویا کوئی میرے سامنے کھڑا ہے۔
"چل" آواز آئی

اور میں بغیر جواب دئیے چل کھڑا ہوا، بغیر ارادہ اور خواہش کے مختار نہ تھا۔ مجبور تھا۔ ——————

——————

اس سیاحت کی داستان تو بہت طویل ہے، مگر یوں سمجھ لیجئے، کہ جہاں میں پہنچا، وہ چاہ نخشب کی آبادی تھی، وہاں جو لوگ بستے ہیں وہ جسم اور گوشت وپوست نہیں رکھتے —— ارواح ہیں —— خالص اور مصفّا —— میرے لئے وہ مناظر عجیب تھے جو میں نے دیکھے —— مکانات —— ایسے —— کہ معلوم نہیں کس چیز سے بنائے گئے تھے، اینٹ، پتھّر، بلور، کچھ بھی نہیں لیکن ایک دُھندلی شکل اُن کی تھی۔ جیسے دھواں! محرابیں اور ستون، اور دروازے، شہ نشین، دالان، حجرے، سب کی وہی صورت تھی جیسی ہمارے تمہارے مکانوں کی لیکن اُن کی دیواروں کو انگلی لگائی تو گویا بھاپ یا دھوئیں یا کُہر کی چادر کو چھُو لیا —— قطعاً غیر محسوس! وہاں کے باشندوں کی حالت یہ کہ آواز کے سوا کچھ نہ تھا۔ —— جسم کی ساری پابندیوں سے آزاد! —— دن اور رات کا امتیاز کچھ نہ تھا۔

وہی ایک روشنی ہر وقت موجود تھی ——— وقت کا حساب بھی کچھ نہ تھا ——— روشنی کا منبع بھی مستور تھا یا ناپید تھا۔ ———

میری رہنما وہی ایک آواز تھی جو کبھی شانہ بشانہ اور کبھی میرے آگے آگے چل رہی تھی، شہر کی سڑکیں، مکانوں کی طرح، ایک چھا ہوا، پھیلا ہوا غبار تھیں ——— میں پاؤں رکھتا لیکن آواز نہ آتی تھی ———

"یہ کیا مقام ہے، جناب؟ اور آپ کون ہیں؟"

جواب میں آواز آئی۔ "چاہ نخشب ہے یہ اور ہم لوگ یہاں کے باشندے ہیں!"

"انسان ہیں آپ؟" میں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"ہاں!"

"جنات تو نہیں؟"

"نہیں!"

"پھر آپ نظر کیوں نہیں آتے؟ یہ کیسی آبادی ہے کہ یہاں کوئی انسان نظر نہیں آتا؟"

"آؤ ——— اندر آؤ" آواز نے مجھے ایک دروازہ کی طرف بلایا۔

جس مکان میں میں داخل ہوا وہ بالکل خالی تھا خالی نظر آتا تھا۔

"بیٹھ جاؤ" آواز نے حکم دیا۔

آواز کرخت نہ تھی، بہت نرم اور شیریں تھی۔ میں نے دیکھا کہ کرسی میز یا تخت کوئی چیز نہیں ہے۔ سوائے اس دخانی فرش کے جس کو میں دیکھتا تھا مگر میرے پاؤں محسوس نہ کرتے تھے ——— گویا بادل پر چل رہا ہوں۔

"بیٹھ جاؤ!" آواز نے پھر کہا۔

میں بیٹھ گیا، بغیر یہ سمجھے کہ کہاں بیٹھتا ہوں

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میں پاکستان کا رہنے والا ہوں، ہرات سے آرہا ہوں اور سمرقند جانا چاہتا ہوں۔ یہ کیا طلسم ہے، جہاں آپ مجھے لے آئے؟"

"طلسم نہیں ہے یہ ——— جو کچھ تم دیکھتے ہو انسانی عقل کا ارتقا ہے ——— تقریباً انتہائی ———"

"عجیب! لیکن آپ نظر کیوں نہیں آتے؟"

"دس لاکھ آدمی اس آبادی میں رہتے ہیں، کوئی نظر نہیں آتا۔ جو چیز نظر آنے والی ہے ——— یعنی مادّہ ——— اس کو ہم نے اپنے وجود سے خارج کر دیا ہے۔ گوشت، پوست، جسم، ہم کچھ نہیں رکھتے ——— اس قسم کی ساری پابندیوں سے آزاد ہیں ———"

"پھر آپ کھاتے پیتے کیونکر ہیں؟"

"ہم اس احتیاج سے کلیتہً آزاد ہیں۔ ضرورتیں اور خواہشیں انسان کی زندگی کو تلخ کرنے والی ہوتی ہیں ——— ہم نے ان سب ——— سے، اپنے وجود کو مستغنی کر لیا ہے ———"

"یہ کیسے؟"

"یہ ایسے کہ ہم عقل کے قدرتی ارتقا کی تقریباً انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں ——— مادہ کثیف چیز ہے، ہم نے ہر قسم کی کثافت کو خارج کر کے اپنے وجود کو اتنا لطیف بنا لیا ہے کہ اب مادّی خواہشیں ہماری زندگی کو تلخ نہیں کر سکتیں۔"

"مگر موت؟ موت کا کیا علاج کیا آپ نے؟"

"موت ——— عقل کی دسترس سے باہر ہے،

اور لاعلاج ۔ ہم بھی مرتے ہیں مگر ہمارا مرنا تمہارے مرنے سے مختلف ہے ۔ تم کفن و دفن کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہو، تمہاری "مادیت" امراض کو اپنے اندر پرورش کرتی ہے —— ہمارے لئے یہ صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی، بیمار ہم نہیں ہوتے، جان کنی کے شدائد سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں، وقت معیّنہ پر دفعتاً غائب ہو جاتے ہیں ۔ ہمارے پاس کوئی چیز مادی نہیں جو بے جان ہو کر باقی رہ جائے ہم گویا فضائے بسیط میں گھل جاتے ہیں ——سرایت کر جاتے ہیں"

"مگر کوئی شکل تو ہو گی آپ کے وجود کی؟"

"کوئی شکل نہیں —— آواز ہے، نظر ہے، حرکت ہے مگر مادی جسم نہیں ہے ۔ ہزارہا برس کی علمی تحقیقات کا یہ نتیجہ ہے ۔

"اور یہ مکانات، یہ محرابیں، یہ دروازے" میں نے حیران ہو کر سوال کیا ۔

"یہ سب غیر مادی ہیں، تم ان کو چھو کر محسوس نہیں کر سکتے ۔ گارا، چونا، پتھر اور لکڑی، جو کچھ مادی تھا وہ سب خارج کر دیا گیا —— یہ سب لطیف اجزا ہیں —— غیر مادی، جن سے ہم عمارتیں بنا لیتے ہیں ——"

"اور آپ کا چلنا پھرنا؟"

"تمہاری اصطلاح میں ہم چلتے پھرتے ہیں ——— ہماری نقل و حرکت ایسی ہے جیسے آسمان کے سیّاروں کی بلکہ سیاروں کی نہیں ——— جیسے اُن کے نُور کی ——— مگر ہمارے مقابلے میں وہ سیارے اور اُن کا نور بھی کثیف اور مادّی ہے"

"عجیب، عجیب! ——— اور وہ جادوگر؛ جو کنوئیں میں سے چاند نکالا کرتا تھا ———"

"ہم میں سے نہ تھا ——— تم میں سے تھا ——— اسی طرح ایک دن اتفاقیہ اس آبادی میں آگیا تھا ہم نے چلتے وقت وہ چاند اس کو تحفۃً دیا تھا ——— مگر وہ اس تحفہ کی قدر نہ کر سکا ——— ——— وہ ٹوٹا ہوا قدیم چاند اب بھی ہمارے کسی کارخانے میں پڑا ہوگا ———"

"کارِخانہ؛ تو آپ کے کارخانے میں پڑا ہوگا ———"

"ہاں، کیوں نہیں ——— قسم قسم کے کارخانے ہیں ——— ہماری اولاد بھی

کارخانوں ہی میں پیدا ہوتی ہے۔"

"یہ کیوں کر؟"

"ہم نے اُس قوتِ ارادی کو جو اولاد پیدا کرتی ہے مشینوں کی شکل میں منتقل کر لیا ہے ——— عورت اور مرد کا امتیاز ہمارے یہاں اب باقی نہیں۔ ملک میں اموات کا اندازہ کر کے جس قدر موتیں ہوتی ہیں اتنے ہی بچے کارخانوں میں بنائے جاتے ہیں اس لئے ہماری آبادی نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے ———"

"عورت اور اُس کا حُسن ———"

"حُسن بالکل مادی چیز ہے، شہوت تمام تر مادیت پر مشتمل ہے۔ یہ گوشت اور ہڈی کی خواہشیں، معدہ کی تحریکات ہیں ——— ہم ان سب سے بالاتر ہیں نر اور مادہ کی تفریق کو ہم نے ختم کر دیا مگر فطرت کا منشا عقل کے ذریعہ سے بہر حال پورا کر لیتے ہیں ———"

"حُسن کے ساتھ شعر اور موسیقی ——— یہ سب!"

"شعریت اور موسیقی تم سے زیادہ ہم میں ہے۔ تمہاری دنیا کی یہی ایک چیز ہے جو خالصتاً لطیف ہے ———

اس ملک سے بہتر موسیقی تم کہیں نہیں پا سکتے ——— تم لوگوں نے موسیقی کی روح کو اپنی مادیت کے اندر مقید کر کر رکھا ہے، ہم نے اُس کو آزاد کر دیا۔ ہماری ساری فضا موسیقی سے لبریز ہے، تم ساز کے بغیر موسیقی کا ایک سُر بھی پیدا نہیں کر سکتے، ہم کرۂ ہوائی میں بغیر ساز کے بہتر سے بہتر راگ پیدا کر لیتے ہیں ——— فضا میں موسیقی کی لطیف لہریں پھیلی ہوئی ہیں ——— "

"عجیب، عجیب! میں حیران تھا کہ کیا کہوں ———

"ہاں! تو وہ چاند جادوگر والا ——— "

"وہ تو محض ایک کھلونا تھا ——— تم اس ملک کو بہت عجیب سمجھتے ہو مگر عجب چیز یہاں کچھ بھی نہیں ——— ہم لوگ عجائب پرست نہیں ہیں ——— جادوگر کی خواہش تھی کہ تمہاری دنیا میں یہاں سے کوئی ایسی چیز لے جائے جو وہاں کے عجائب پرست لوگوں کو حیران کر دے ہمارے ایک کاریگر نے یہ کھلونا بنا کر اس کو دے دیا ——— مگر یہ صنعتیں فضول اور بے نتیجہ ہیں ——— ہم اپنا وقت یوں ضائع نہیں کیا کرتے ——— "

کوئی بادشاہ ہے آپ کا؟"

"ہماری آبادی دس لاکھ ہے اور دس ہی لاکھ بادشاہ ہیں۔ ہر متنفس بادشاہ ہے ——"

"پھر ملک کا انتظام؟"

"انتظام کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بدانتظامی کا امکان ہو تو انتظام کیا جائے! ہم نے بدنظمی اور بدامنی کے اسباب ہی باقی نہ رکھے —— پھر انتظام کی ضرورت کہاں! بدانتظامی پیدا ہوتی ہے معدہ سے، غذا کے نتائج بہت خطرناک ہوتے ہیں —— خالص انسانیت کے لئے —— آنتوں کو بھرنے کے لئے اور آنتوں کے بھرے ہونے کی وجہ سے، لوگ جرائم کرتے ہیں —— سارے جھگڑے اسی مرکز سے پیدا ہوتے ہیں، ہم نے اس مرکز ہی کو ختم کر دیا!!

"تو پھر گویا آپ کی زندگی بے مقصد ہے اور کوئی کام ہی نہیں جو آپ کریں۔؟"

"یہ صحیح نہیں، تم سمجھتے ہو کہ ہماری زندگی کا مقصد کچھ نہیں اور کام بھی کچھ نہیں —— مگر جو مقاصد تم لوگوں

کے ہوتے ہیں اور جو کام تم کرتے رہتے ہو اس سے تو یہی
بہتر ہے کہ کوئی کام اور مقصد نہ ہو ——————
اور مقصد اور کام ہمارے لئے بہت ہیں ——————
اتنے کہ ہم کو فرصت ہی نہیں ملتی ——————"

"وہ کیا؟"

"انسانی عقل کا ارتقاء —————— ہم
بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ موت سے ادھر ہمارے لئے
کوئی چیز مشکل نہیں، ہم نے خالص انسانیت کا صحیح معیار
قائم کر لیا ہے —————— البتہ موت ایک دیوار ہے
سد سکندری ہے جس کے آگے ہم نہیں جا سکتے اور جانا
بھی نہیں چاہتے —————— ہمارے لئے جو حدود
مقرر ہیں ان کے اندر ہم ترقی کر رہے ہیں ——————
ترقی کر چکے!! ——————

میں حیران اور بدحواس ہو گیا —————— وہم و گمان
سے باہر یہ عالم! —————— کبھی دیکھا نہ سنا ——————
"آپ اس ہماری دنیا میں ٹھہرنا چاہیں تو کچھ عرصہ ٹھہر

سکتے ہیں ـــــــ لیکن کوئی چیز ایسی نہیں جس کو آپ دیکھ سکیں، کوئی منظر ایسا نہیں جس سے آپ لطف اندوز ہو سکیں. تاوقتیکہ آپ کی مادی کثافت دُور نہ ہو اور آپ ہمارے وجود کی لطیف فضا میں داخل ہو سکیں ـــــــ اس کے لئے آپ رضامند ہوں تو بہت عرصہ تک ہمارے مقتل میں آپ کو رہنا ہو گا ـــــــ"

"یہ میں نہیں چاہتا" میں نے گھبرا کر کہا "میں اپنی دُنیا میں جانا چاہتا ہوں ـــــــ مجھے میری دُنیا میں پہنچا دیجئے ـــــــ"

مجھ پر ایک خوف طاری تھا، میں پسینہ میں تر تھا، میرے جسم میں رعشہ تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا حبس دوام کی سزا پانے والا ہوں ـــــــ

"ہم جانتے ہیں ـــــــ کثافت کے کیڑے کثافت سے نکلنا نہیں چاہتے اور نکالے جاتے ہیں تو اکثر مر جاتے ہیں ـــــــ ہمارے مورث اعلیٰ نے بہت بڑی قربانی کر کے، بہت سی سختیاں برداشت کرنے کے بعد اس زندگی کا راز حاصل کیا تھا، ہماری کتنی ہی نسلیں، غیر مکمل اور ناقص

حالت میں گذر گئیں تب آج ہم ارتقا کے اِس درجہ پر پہنچے ہیں ——— تمہارے لئے بہت مشکل ہے

میں جانتا ہوں ———"

میں ڈر رہا تھا کہ کہیں میرے کان میں یہ آواز نہ آئے کہ اب تو جا نہیں سکتا! میں نے گھبرا کر کہا:۔

"تو پھر مجھے پہنچا دیجئے!"

"جا! اے انسان ناقص ——— تو کیا سے کیا ہو جاتا اگر تو سمجھ سکتا، لیکن تیری روح کو تیرا گوشت پوست زنگ کی طرح چپٹ گیا ہے ——— روح اور جسم دو الگ چیزیں تھیں ——— ایک اصل تھی اور دوسری نقل ——— اصل اور نقل اس طرح مل گئے ہیں کہ اصل کو نقل سے جدا کرنا مشکل ہو گیا ہے!! ——— جا!!"

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا "مجھے بھی کوئی تحفہ۔ اس مُلک کا!"

دفعتاً یہ معلوم ہوا کہ میرے دماغ میں کسی نے ایک گرم لوہے کی سلاخ رکھ دی ہے ——— بیتاب ہو گیا ——— نزع کی سی حالت مجھ پر طاری تھی

"بے وقوف انسان ———— یہ تیرے لئے ہمارا تحفہ ہے۔ ایک نشانی ہم نے تجھے دی ہے، تو بے تاب اور بے چین رہے گا جب تک کہ تیرا جوہر لطیف مادّیت کے بند لفافہ کو چاک کر کے نکل نہ جائے ———— آزاد نہ ہو جائے ———— تو ہمیشہ بے چین رہے گا ———— تو ہماری دُنیا کو بھول نہ سکے گا اور ایک دن پھر تو واپس آئے گا ———— ———— جا!"

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے دماغ کے اندر ایک تڑاقا ہوا اور کوئی چیز پھٹ گئی، زنجیر کی کوئی کڑی تھی جو ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گئی

سرائے کا بھٹیارا مجھے ڈھونڈتا ہوا کنوئیں کی طرف آیا، اُس نے دیکھا کہ میں چبوترے پر پڑا ہوا ہوں ———— بے ہوش ہوں یا سو رہا ہوں ———— اُسی طرح مجھے سرائے میں لے گئے ———— صبح کو میں

نے اپنے کو سرائے کی ایک کوٹھری میں پڑا ہوا پایا ——
میں نے اپنی واردات کسی سے بیان نہیں کی۔ لیکن میں سمرقند
جانے کے بجائے ہرات کی طرف لوٹ آیا اور وہاں سے چند
ہی روز ہوئے کہ وطن پہنچا ہوں ——

—— چاہ نخشب کی یاد دل میں چٹکیاں لے
رہی ہے —— کوئی مجھے پھر
بُلا رہا ہے —— کوئی مجھ سے کہہ
رہا ہے —— اس چہ بچّہ سے
جس کا نام زندگی ہے نکل —— اے
کیڑے! انسانیّت کا دعوےٰ کر ——
دعوےٰ کرنے کے قابل ہو جا ——
وہی انسانیّت جو کہیں چاہِ نخشب کے جوار میں ہے!
—— ماہِ نخشب چاہِ نخشب!

ماہ نخشب، چاہ نخشب!!! موت کے سمندر میں
زندگی کا ایک سرسبز جزیرہ، جہاں نہ امروز ہے نہ
فردا! صحرائے عظیم میں وہ نخلستان جہاں نہ آندھیاں
ہیں نہ بجلیاں! ——

——— اگر جنّت کا تخیّل بھی کوئی حقیقت رکھتا ہے
تو وہ یہی ہے کہ آدمی نہ زندگی کی کثافت سے محفوظ ہو جائے
——— سکونِ کامل ہو اور نہ زندگی
بے مقصود اور بے حساب ہو !!!
یہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ جو کوئی میری بات نہ سمجھے وہ نہ سمجھے
مجھے پروا نہیں ——— اور جو کوئی
کچھ سمجھے وہ ایک دفعہ چاہِ نخشب تک ضرور ہو آئے !!!

لیلیٰ کے خطوط

قاضی عبدالغفار

عورت چراغ خانہ ہو یا شمع رہ گزر، بہرحال عورت ہی رہتی ہے - بھوکے مرد کے دندان ہوس اس کے جسم میں پیوست ہوتے ہیں، لیکن زخم اس کی روح میں پڑتا ہے اور یہ زخم جب ناسور بنتا ہے تو اس کی آہ و کراہ سارے معاشرہ کی بنیادوں کو لرزا دیتی ہے۔

عورت — جسم فروش عورت کی یہ دل دوز داستان جب ادب کا روپ دھارتی ہے تو قاضی عبدالغفار مرحوم کی "لیلیٰ کے خطوط" وجود میں آتی ہے۔

قیمت تین روپے

آئینۂ ادب چوک مینار انار کلی، لاہ

سرورق ربن پریس، لاہور میں چھپا